بیکار کی باتیں

طنز و مزاح کی ایک ناکام کوشش

بیکار کی باتیں لاکھوں بار اور کام کی باتیں کبھی کبھی

آرزو لکھنوی

میر فاروق علی

جملہ حقوق ہرقاری کے حق میں محفوظ

سنہ اشاعت:- ۱۹۹۴ء

تعداد اشاعت:- ایک ہزار

سرورق:- جناب سعادت علی خاں

اندرونی سرورق:- جناب سلام خوشنویس

کتابت (کمپیوٹر):- نسرین خان

طباعت سرورق:- اسپیڈ پرنٹس - آفسیٹ پرنٹس اینڈ بائینڈرس

طباعت:- اسپیڈ پرنٹس، سعیدآباد، حیدرآباد - فون 873538

ناشر:- مکتبہء شعروحکمت حیدرآباد

قیمت:- صرف ایک سو روپیئے Rs. 100=00

پتہ مصنف:- میر فاروق علی - 17-8-659/5

شاہ کالونی - دبیر پورہ ریلوے اسٹیشن

حیدرآباد - 500 024

ٹیلیفون: 527023

یہ کتاب آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی جزوی اعانت سے شائع ہوئی ہے

انتساب

میں اس کتاب کو اپنے والدین، بہنوں

بھائی، شریک حیات اور بچی

رابعہ شاداب

کے نام معنون کرتا ہوں جن کی

محبت، شفقت، تربیت اور ساتھ کی

وجہہ سے مجھے اطمینان اور سکون نصیب ہوا

اور

میں تخلیقی مصروفیات

کی طرف متوجہ ہو سکا

ذرّہ ہی سہی سنبھال قلم، آفتاب لکھ!
قطرے کی آنکھ کے لیے دریا کا خواب لکھ!
مظفر مجاز

ردّی دان سے......

نمبر شمار	عنوانات	
۱۔	کام کی باتیں ---------- جناب مضطر مجاز	۶
۲۔	اعانت نامہ ------------ میر فاروق علی	۱۵
۳۔	دورہ	۲۷
۴۔	ایمسٹ ۔ عقلمند بیٹے اور ہوشیار باپ کا امتحان	۳۲
۵۔	مصروفیت	۳۸
۶۔	کرسی کرسی اور کرسی	۴۳
۷۔	نہ مانے بڑوں کی ریت گھر گھر مانگے بھیک	۵۱
۸۔	انگریزی کی روٹی اردو کے گن	۵۸
۹۔	مصطفیٰ کمال اول درجہ کا کنوینر	۶۲
۱۰۔	آم کھاؤ کلام سناؤ	۶۶
۱۱۔	کملاکر راؤ نائڈو کمل ۔ ڈپٹی کمشنر اکسائیز (بیک وقت عہدیدار، شاعر، ادیب اور دوست)	۷۱
۱۲۔	اسلم فرشوری ۔ نگینہ	۷۹
۱۳۔	شراب برائیوں کی جڑ (ریڈیائی تقریر)	۸۳
۱۴۔	ثبوت	۸۸
۱۵۔	واہ حیدرآباد (مزاحیہ تبصرہ)	۹۲
۱۶۔	زندہ دلان حیدرآباد کا ایک اور کارنامہ (مزاحیہ سرسری تبصرہ)	۱۰۳
۱۷۔	سخن (مجموعہ کلام) سرسری تبصرہ	۱۰۸

طنز و ظرافت نگار دراصل ایک طرح کا آتنک وادی ہوتا ہے۔ وہ جب اپنے اطراف ہر شعبۂ حیات میں پھیلی ہوئی ناہمواریوں، ناانصافیوں اور نالائقیوں کو دیکھتا ہے اور یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اس کے پاس اس بگڑے ہوئے سماج اور معاشرے کی اصلاح اور درستگی کے لئے نہ طاقت ہے نہ اقتدار تو وہ نچلا بیٹھ کر ملّاؤں اور بیواؤں کی طرح رونے بسورنے اور کڑھنے یا وعظ و نصیحت کا پٹارہ کھولنے کے بجائے اپنے اسلحہ خانے سے رجوع ہوتا ہے اور طنز، طعن، تشنیع، پھبتی، فقرہ ستم ظریفی اور تجاہل عارفانہ غرض ہر قسم کے چھوٹے موٹے ہتھیار نکال کر اپنے معاشرے پر ڈھکے چھپے حملے شروع کر دیتا ہے۔ ان حملوں سے صاحبانِ عزت واقتدار اور نام نہاد معتبرانِ قوم تڑپنا، تلملانا اور جھلّانا شروع کر دیتے ہیں اور وہ دور کھڑا ان کی قابلِ رحم حالت پر مسکراتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ بعض جغادری فلسفی قسم کے لوگ طنز و ظرافت کا شمار فراری ادب میں کرتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہیکہ خرابیوں اور تاریکیوں کے

خلاف جہاد میں یہ طنز نگاری ہے جو سب سے آگے ہے ۔ وہ اس آنے والے انقلاب کے لئے زمین ہموار کرتا ہے اور بہت چبھتے ہوئے تیکھے انداز میں سماج کی خرابیوں اور برائیوں کو نمایاں کرتا ہے جنھیں اکثر وبیشتر معاشرے کے سفاک صاحبانِ اقتدار کی چالاکی اور ہوشیاری کئی پردوں میں ڈھانکے اور چھپائے رکھتی ہے۔ انقلاب کی صبح کا یہ مؤذن اور طائرِ پیش رس ہمیشہ چشم کم سے دیکھا جاتا رہا ہے ۔ ادب کے سنجیدہ بقراطی نقاد تو اسے ادب ہی ماننے پر تیار نہیں ہوتے ۔ وہ تو خیر ہوئی کہ اس صنفِ ادب میں یوسفی، یوسف ناظم، ابن انشا، مجتبیٰ حسین جیسے اہم اور قدآور طنز وظرافت نگار پیدا ہوگئے ورنہ ہمارے نقادانِ کرام اس صنف کو سرے سے صفحۂ ہستی ہی سے مٹا کر دم لیتے ۔ ممکن ہے کہ انھیں اس راہ سخن میں خود اپنی عزت وعافیت بھی خطرے میں نظر آئی ہو کیونکہ طنز نگار تو اپنوں اور پرایوں میں کوئی فرق ہی نہیں کرتا ؎

اک نعرۂ مستانہ کعبہ ہو کہ بت خانہ

ان قابل احترام نقادان ادب نے کچھ کم دھما چوکڑی اور داداگیری نہیں مچا رکھی ہے وہ تو یہ خوب جانتے ہیں کہ طنز نگار جب لہر میں آتا ہے تو اپنے باپ کی ڈاڑھی سے بھی کھیلنے سے نہیں چوکتا اور باپ بچارا " بازی بازی با ریش بابا ہم بازی " بڑبڑاتا ہوا جھلا کر رہ جاتا ہے ۔ اس طرح اگر ہم یہ سمجھیں تو بیجا نہ ہوگا کہ طنز نگاری اس بات کی علامت ہے کہ ابھی سماج زندہ ہے اور سانس لے رہا ہے اس میں زندگی کی خاصی رمق باقی ہے کیونکہ طنز نگار کے قلم میں سماج کے نیک نفسوں کا اجتماعی شعور سانس لیتا ہے ۔

حیدرآباد میں طنز و مزاح کا فروغ بڑی چونکا دینے والی بات ہے۔ نہ صرف ملک بلکہ بیرون ملک بھی جہاں کہیں کسی حیدرآبادی ادیب اور شاعر کا تعارف ہوتا ہے تو لوگ اس سے طنزیہ اور مزاحیہ فن پاروں کی پیش کشی کی توقع رکھتے ہیں۔ دنیا کے اس حصّے میں اس صنف ادب کے عروج میں ظاہر ہے کئی سیاسی اور سماجی عوامل کار فرما رہے ہیں۔ غالباً اس کا پہلا سبب تو سیاسی ہی ہے۔ شاید یوں ہوا ہے کہ اردو والوں (جن میں ہندو، مسلم، سکھ، پارسی، عیسائی سبھی شامل ہیں) کے ہاتھوں سے جب عنان اقتدار چھنی تو انھوں نے بدلے ہوئے حالات میں اپنے آپ کو بے یار و مددگار پایا۔ "شب تاریک و بیم موج و گرداب چنیں ہائیل" ان کی نظروں کے سامنے ایک ایسے سماج کی نیو رکھی جانے لگی جس کی بولی اجنبی، طور طریق نامانوس، رہن سہن بیگانہ اور راتوں رات ان کا حاکم سے محکوم بن جانا ایک ایسا المیہ تھا جو ظاہر ہے یا تو المیہ نگاروں کو جنم دے سکتا تھا یا طنز نگاروں کو۔ لیکن تاریخی عوامل نے طنز و مزاح کے سفیروں کو ابھارا جن میں یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، مسیح انجم پرویز یداللہ مہدی اور برہان حسین سے لیکر آج کل کے وہ سارے طنز و مزاح نگار شامل ہیں جنھوں نے ابھی ابھی قلم پکڑنا سیکھا ہے۔ (شاعروں کی فہرست پھر کبھی!) اسی قافلۂ شوق میں کہیں میر فاروق علی شامل ہو گئے ہیں۔ اردو کے تقریباً تمام ادیبوں اور شاعروں کی طرح فاروق علی کا تعلق بھی ادب سے "ناجائز" ہے کیونکہ وہ روٹی تو اپنی ملازمت (محکمہ آب کاری) کی کھاتے ہیں اور گن علم و ادب کے گاتے ہیں۔ ستم ظریفی

(IRONY) ان کا خاص اور پسندیدہ ہتھیار ہے چنانچہ قدرت نے بھی ان کے ساتھ بڑا ستم ظریفانہ کھیل کھیلا ہے کہ جب ان کی اولین تصنیف شائع ہونے جارہی ہے اور یہ سطریں لکھی جارہی ہیں تو صوبہ آندھرا پردیش میں شراب نوشی ممنوع قرار دی جارہی ہے اور مصنف کا تعلق محکمہ آب کاری سے ہے جس میں وہ۔جہاں تک شراب نوشی کا تعلق ہے عین دریا میں حباب آسا اپنا پیمانہ نگوں ہی رکھتے ہیں یعنی دریا میں رہ کر پیاسے رہنا ہی پسند کرتے ہیں اور اب جب کہ شراب نوشی پر امتناع عائد ہونے جارہا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس سے کوئی فرق پڑنے والا ہے؟ کیا عجب اب بھی کوئی نہ کوئی زندہ دل غالؔب ان سے مخاطب ہو کر کہہ اٹھے۔

ساقی گری کی شرم کرو آج ، ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مئے جس قدر ملے

وہ شراب انگور پیتے پلاتے نہ ہوں لیکن شراب علم کی پیاس انھیں کشاں کشاں ادبی جلسوں، ادیبوں اور شاعروں میں لئیے لئیے پھرتی ہے۔ داؤد اشرف، نعیم زبیری، مصطفیٰ کمال، چندر سریواستو اور اعجاز قریشی جیسے ادیب، محقق اور صحافیوں سے ان کی اک زمانۂ دراز سے یاد اللہ ہے اور ان بزرگوں سے (ان کے بزرگ) انھوں نے عبرت کے علاوہ اور بھی بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ میں اگر یہ کہوں تو شاید زیادہ غلط نہ ہو کہ ان کی شخصیت اور فن کی تعمیر و تشکیل میں حیدرآباد کے ان ادیبوں اور دانش وروں کا اچھا خاصہ حصہ رہا ہے۔

صحبت مردانِ حر آدم گر است!

صحبت بہ ہر حال علم کتابی سے بہتر ہے کیونکہ ہم نے علم کتابی کے حصول میں سرگرم ایسے دانش وروں کو بھی دیکھا اور سنا ہے جو رجحان کو رجحان، طبعزاد کو طبغراد، پِل پڑا کو پَل پڑا، پڑھتے ہیں۔

ایسے ہی ایک موقع پر سعدی شیرازی ہمارے کان میں آکر کہنے لگے۔

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملّا

کار طفلاں تمام خواہد شد

(ہو یہی مکتب اور یہی ملّا؛ کار طفلاں تمام ہی سمجھو)

شاید یہی ہمارے معاشرے کی ناہمواری ہے کہ جس کو ہل چلانا چاہئیے وہ قلم چلا رہا ہے (جیسے راقم الحروف) جس کو کسی جامعہ میں صدر شعبہ ہونا چاہئیے وہ کوئی رسالہ نکال رہا ہے۔ (جیسے مصطفیٰ کمال) جس کو بیدی اور منٹو کا خلا پر کرنا چاہئیے وہ دفتر میں بیٹھا قلم چلا رہا ہے (جیسے نعیم زبیری) جس کو کسی دارالترجمہ یا دارالادب میں ادب اور ترجمے کے رموز سمجھانے چاہیئں وہ ناخواندہ نوجوانوں کو کنکروں اور پتھروں کی معرفت فراہم کر رہا ہے (جیسے یوسف کمال) جس کو ابن انشا اور فکر تونسوی کا جائزہ لینا چاہئیے وہ مدرسے کے لڑکوں کو تلنگی زبان کی قواعد پڑھا رہا ہے (جیسے مسیح انجم)۔

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا!

اب کہاں تک مثالیں گنائی جائیں اگر یہ بات طول پکڑے تو پھر ایسی

مثالیں بھی سامنے آجائیں گی جہاں اسپِ تازی پالان کے نیچے لہو لہان نظر آئے گا اور گدھے کا گلہ طوقِ زرّین سے جگر جگر چمک رہا ہوگا۔ تو یہ ہے وہ ماحول جس میں اگر کوئی فاروق علی جنم نہ لے تو صورت حال بڑی الم ناک اور گمبھیر ہوجائے۔ فاروق علی جیسے طنز نگار اس بات کا ثبوت ہیں کہ معاشرہ ابھی زندہ ہے ہمارا اجتماعی شعور ابھی سانس لے رہا ہے اور بہتری کی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔ یہ بات اور ہے کہ مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک کبھی اثر نہیں کرتا اور ہمیں اربابِ حلّ و عقد اور صاحبانِ اقتدار کی شکل میں مردانِ ناداں ہی سے تو سابقہ ہے۔ تاہم صاحبانِ ضمیر تو ہر دور میں رہے ہیں۔ وہی فاروق علی بلکہ ہر ادیب، فن کار، شاعر اور طنز نگار کے مخاطب بھی ہوتے ہیں کیونکہ بزم میں اہلِ نظر بھی ہوتے ہیں اور تماشائی بھی۔ لیکن فن کار کا مخاطب اصلی اہلِ نظر ہی ہوتا ہے۔

فاروق علی کے اسلحہ خانے میں یوں تو بہت ہتھیار ہونگے لیکن وہ سب سے زیادہ ستم ظریفی (IRONY) کا قرابینچہ استعمال کرتے ہیں لیکن طنز نگار کو تیغ ہو یا تبر اپنے ہتھیار کے استعمال میں بہت احتیاط کرنی چاہئیے ورنہ اس کا حشر بھی فسانۂ آزاد کے خوجی کا سا ہوسکتا ہے کہ آپ اپنی تیغ سے گھائل تڑپتا رہ جائے۔ فاروق علی نے اپنے اوزار، آلات اور ہتھیار بڑی احتیاط سے استعمال کئیے ہیں وہ ایسے "میاں نجار" نہیں جو اپنے آلات ہی کے ہاتھوں خود ہی چھیلے جائیں۔ اگرچہ یہ ان کی پہلی کاوش ہے لیکن انھوں نے رندوں کا استعمال بہت سنبھل سنبھل کر کیا ہے۔

انھوں نے اس جنگ میں ایسے ہی آلات استعمال کیئے ہیں جو اپنے معمول کو زخمی اور لہولہان نہیں کرتے بلکہ ہلکے ہلکے "چرپٹے" لگاتے ہیں جس سے معمولی سی خراش آتی ہے اور بس! وہ سفاک مسیحا نہیں ۔ بہت زیادہ چیر پھاڑ نہیں کرتے ان کی نرم خوئی اور شائستگی شاید انھیں اس کی اجازت نہیں دیتی حالانکہ محمل اسقدر گراں ہے کہ حدی جس قدر تیز تر گائی جائے کم ہے

زیر نظر کتاب میں جملہ (۱۴) مضامین ہیں جن میں چار شخصی خاکے ہیں دو مزاحیہ مضامین کے مجموعوں پر تبصرے ہیں اور مابقی اپنے اطراف واکناف کے احوال و مقامات پر ہلکے پھلکے مضامین ہیں ان میں سب سے اہم اور کامیاب مضمون " Eamcet عقلمند بیٹے اور ہوشیار باپ کا امتحان" ہے جس میں پیشہ وارانہ مضامین (میڈیسن اور انجنیرنگ) میں کامیاب ہونے والے " ہونہاروں " کے نام نہاد اقلیتی اداروں میں داخلے کی کدو کاوش کا ستم ظریفانہ جائزہ لیا گیا ہے ۔ ہر کس و ناکس کے سر میں ان دنوں یہ سودا سمایا ہوا ہے کہ اس کا لڑکا یا لڑکی یا تو ڈاکٹر بنے یا انجنیر اور پھر اس خواہش کے پیچھے حصولِ علم یا خدمتِ خلق کے جذبے کے مقابل ، زرگری کی خواہش اور سوسائٹی میں گردن اکڑا کر چلنے کی تمنّا کا زیادہ دخل ہے ۔ لگے ہاتھوں مصنف نے ان نام نہاد اقلیتی اداروں کے لتّے بھی لے لیئے ہیں جو اقلیتوں کے نام پر اپنا الّو سیدھا کر رہے ہیں ۔ مختصر یہ کہ ایک ہی تیر میں اس نے کئی شکار کرلیے ہیں ۔ مضمون نگار اس مضمون میں اپنے "فل فارم" میں نظر آتا ہے ۔ دوسرے مضامین میں

عابد معز کی کتاب " واہ حیدر آباد " پر تبصرہ ہے ، جس میں " معزکوئیز " مضمون نگار کی بہت عمدہ اختراع ہے ۔ مسیح انجم کی کتاب " طرفہ تماشہ " پر تبصرہ بہت سرسری ہے ۔ اس کتاب میں تبصرہ نگار کو زیادہ تکلیف اس بات کی محسوس ہوتی ہے کہ مقدمہ نگار نے بڑی خسّت سے کام لیا ہے (ایک صفحہ سے بھی کم) جبکہ اسی مقدمہ نگار (مصطفیٰ کمال) نے عابد معز کی کتاب پر بڑا سیر حاصل مقدمہ لکھا ہے ممکن ہے اس کے جواب میں مقدمہ نگار یہ کہے کہ مسیح انجم کا فن اور شہرت کسی مقدمے کے محتاج نہیں ۔

خاکہ نگاری بھی ان دنوں فن کاری سے زیادہ ایک فن کی شکل اختیار کر گئی ہے ۔ بعض خاکہ نگاروں نے ایسے ایسے Silly-mid-on قسم کے لوگوں کے بھی خاکے لکھ دیئے ہیں جن کی اہمیت (حیثیت نہیں) صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ کسی نہ کسی اہم عہدے پر فائز ہیں ۔ فاروق علی کو ابھی یہ فن نہیں آیا خیر زمانہ انھیں یہ بھی سکھا دے گا ۔ کتاب میں شامل چار عدد خاکے ان کے سینیر یا جونیر دوستوں پر لکھے گئے ہیں ان میں مصنف نے اپنا نام اور دوسرں کی پگڑی اچھال کر سرخ رو ہونے کی کوشش نہیں کی ۔ البتہ ان میں سے بیشتر ان کے دیگر مضامین اور تبصروں کی طرح سرسری ہیں ۔ انسان جو قدرت کا سب سے بڑا جہانِ معنی ہے اس جہان سے مصنف سرسری گذر گیا ہے ورنہ یہاں تو بقولِ میر

ہر جا جہانِ دیگر ہے

اتنی دروں بینی کی توقع اس ابھرتے ہوئے فن کار سے قبل از وقت ہوگی میرا انھیں یہی مشورہ ہے کہ وہ نہ صرف انسانوں کو پڑھیں ، جس پر ان کی توجہ ذرا زیادہ ہے ، بلکہ انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو بھی پڑھیں ، لیکن اس میں ایک خطرہ بھی ہے کہ اس طرح کہیں ان کی وہ معصومیت ان کے صفحۂ دل سے دُھل نہ جائے جس سے ان کی یہ تحریریں عبارت ہیں - اس کے لئے ان کو بہت کچھ پڑھ کر اسے بھول جانا پڑے گا تاآں کہ وہ ان کے لاشعور کا جز بن جائے - یہ "باخبر بے خبری" ہی ہے جو فن کو جلا عطا کرتی ہے لیکن ؂

بڑی مشکل سے میاں بے خبری آوے ہے -

حیدرآباد دکن

۱۴/ دسمبر ۱۹۹۴ء

اعانت نامہ

اعانت نامہ اور اعمال نامہ دو علاحدہ چیزیں ہونے کے باوجود دونوں جڑواں بہنوں کی طرح ہیں ۔ طنز و مزاح کے مضامین کے مجموعے "بیکار کی باتیں" کے سلسلے میں اعانت نامہ کا سلسلہ طویل ہے ۔ ایک دو نام ہوتے تو احسان مندی کا اظہار کرتے ہوئے فرض کی ادئیگی سے بہ حسن و خوبی سبکدوش ہوجاتے لیکن یہاں بات ہی مختلف ہے ۔ اس مجموعے میں مضامین سے بڑھ کر ان احباب کی تعداد ہے ، جن کا میں مشکور ہوں جنھوں نے اوپری دل سے یا دل کی گہرائیوں سے مختلف موقعوں پر یہ مضامین سن کر واہ واہ کی ہے ۔ اس واہ واہ میں پتہ نہیں حقیقی داد پوشیدہ تھی یا طنز و مزاح یا مضحکہ چھپا ہوا تھا ۔ کیونکہ آج تک داد اور تعریف کا تجزیہ کرنے کی کوئی Laboratory دنیا میں نہیں بنائی گئی ہے ورنہ ناپ تول کر پتہ لگالیتے ۔

اس مجموعے کی اشاعت کے سلسلے میں اردو اکیڈیمی کے مجس کا مزاحیہ فیصلہ اس صدی کا ایک اہم واقعہ قرار دیا جانا چاہیے ، جنھوں نے اس مجموعے کی اشاعت کے سلسلے میں مالی اعانت کی سفارش فرمائی سب سے پہلے (۱) عالی جناب نعیم زبیری جو ہندوستان کے علمی گھرانے میں اس وقت پیدا ہوئے جب کہ ہندوستان میں سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ علمی نرسنگ ہومس قائم نہیں ہوئے تھے ۔ محترم نعیم بھائی کے ساتھ ربع صدی سے طویل ملاقاتیں رہیں ان کی تحریر کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے کان سماعت کے قابل جب ہوئے تب ہی ان کا ذہن علمیت سے لبریز ہو چکا تھا ۔ یہ اس وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ کئی دوسری شخصیتیں جنکا تعلق علمی گھرانوں سے بھی رہا ہے اور وہ علم کے حصول کے سلسلہ میں جامعہ کی آخری سیڑھی تک چڑھنے کا اعزاز بھی رکھتی ہیں اس کے باوجود بھی نعیم بھائی کی تخلیقی صلاحیت (افسانے) سے مقابلہ تو کجا ان سے بہت پیچھے نظر آتے ہیں "بیکار کی باتیں" —— اردو بازار میں ہرگز ہرگز نہ آتیں اگر محترم نعیم بھائی نے ان تحریروں کی زبان و بیان کی نوک پلک درست نہ کی ہوتی ۔

جناب چندر سری واستو صاحب سے میری پہلی ملاقات 1964 میں انجمن تحفظ اردو کانفرنس کے سلسلے میں ہوئی ۔ ان دنوں میں

گلشن اردو ادب کا معتمد عمومی تھا۔ جناب خواجہ احسان اللہ صدر گلشن اردو ادب ، اور جناب انور اللہ حسینی ، جناب پاشاہ میاں ، جناب محمد دستگیر، جناب محمد عبدالغفار، جناب ریاض احمد، جناب بشیر الدین اور جناب حبیب صالح عہدہ داران انجمن کے ہمراہ جام باغ حیدرآباد پر واقع کانفرنس کے دفتر پر جناب چندر سری واستو صاحب سے ملاقات ہوئی اور کانفرنس میں شرکت کے لئے فیس کی ادائیگی کے بعد بحثیت مندوب کارڈ حاصل کیا گیا۔ ان دنوں ہماری بزم کی جانب سے طریقت منزل چیلہ پورہ پر ادبی اجلاس اور مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے اسکی خبریں اخبار میں اشاعت کے لئے بزم کے معتمد نشرواشاعت جناب حبیب صالح راست اخبارات کے دفتر پہنچایا کرتے تھے۔

ہم سب ساتھی ان دنوں گورنمنٹ ہائی اسکول چوک کے دسویں کے طالب علم تھے جناب چندر سری واستو کے مشورے پر بزم کی خبریں بھارت نیوز سرویس کو پہنچائی جانے لگیں۔ اس طرح جناب چندر سری واستو سے ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔ ان کے رویے میں خلوص ، محبت ، مروت اور مشورت اتنی زیادہ پائی گئی کہ میں نے ان کے رویے سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے جناب چندر سری واستو کو کاٹ چھانٹ ، توڑ موڑ کر "چندر بھائی" بنادیا اس پر بھی ان کی پیشانی پر بل نہ آیا آج تک یہ

روایت برقرار ہے ۔ اس مجموعے کی اشاعت پر امید رکھتا ہوں کہ ان کو دلی خوشی ہوگی ۔

۳ اعجاز بھائی بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جنکا راست تعلق چاہے ادب ، شاعری اور ثقافتی زندگی سے نہ ہو لیکن انکی شخصیت اپنی جگہ اہم ہوتی ہے ۔ ایک نام محترم اعجاز قریشی صاحب کا ہے جن کی شخصیت اور جن کے ادارے " بھارت نیوز سرویس " میں ڈھل کر بے حساب احباب آج دنیا کے کونے کونے میں نمایاں مقام حاصل کر چکے ہیں ۔ اس ادارے میں عام صحافت کے ساتھ ساتھ ادبی صحافت ، اسپورٹس ، کرائیم حد یہ ہے کہ فلمی صحافت کی تربیت بھی حاصل ہوتی ہے ۔ دنیا میں کوئی ایسا اسکول ہنیں ہوگا اس ادارے سے فارغ التحصیل احباب کی مردم شماری کی جائے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ محترم اعجاز قریشی اور ممتاز صحافی عالی جناب چندر سری واستو جن کو اردو ، تلگو اور انگریزی پر یکساں عبور حاصل ہے ان کی اعزازی خدمات کو جمع کیا جائے تو ——— ان کے ادارے کا نام گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل کیا جاسکتا ہے ۔ ان سر چشمۂ ذہانت سے استفادہ کرنے والوں کو کئی زمروں میں شامل کیا جاسکتا ہے ان میں چند بڑے بڑے نام بھی شامل ہیں جو موصوف سے برسوں مشورہ کرنا ضروری سمجھتے رہے ہیں ۔ دوسرے زمرے میں وہ شامل ہیں جنھوں نے آپکی رہنمائی حاصل کی ہے

اور آپ کی رائے اور خیالات سے استفادہ کیا ہے ۔ تیسرے زمرے میں وہ لوگ شامل ہیں جو جزوی طور پر آپکے شاگرد یا جونیر رہے ۔ چوتھا زمرہ باقاعدہ اور مکمل شاگردوں کا ہے ۔ پانچویں زمرے میں مجھ جیسے ناخلف بھی شامل ہونگے ۔ اعجاز بھائی کی ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ اگر ہم خاطر خواہ استفادہ کرسکتے تو کیا اچھا ہوتا لیکن مستقل مزاجی کے فقدان نے اسکا موقعہ نہیں دیا اس تحریر میں میں صرف ان چند شاگردوں کے نام گنوانا چاہتا ہوں جنھوں نے نہ صرف آپ سے بہت کچھ سیکھا بلکہ آپ کا نام روشن کیا ۔ ان میں میرے عزیز دوست ہلال مرتضیٰ، سعودی عرب میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں ۔ عارف الدین سلیم جو کچھ عرصہ پہلے داغ مفارقت دے گئے" زین العابدین جنہوں نے امریکہ سے بھی لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے ۔ شوکت علی خاں جو ان دنوں روزنامہ " سیاست سے وابستہ ہیں، عطاء اللہ جو کویت میں مقیم ہیں اور باقاعدگی کے ساتھ خبر نامہ بھیجا کرتے ہیں ۔ خود جناب اعجاز قریشی کے فرزند اکبر احسن قریشی M.S Communication اور Ph.D کرنے کے لئے U.S.A. میں مقیم ہیں اور وہاں کی انگریزی اور اردو صحافت اور T.V. کے توسط سے اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرتے رہتے ہیں ۔ جناب محمد حمید الظفر، جو میرے دیرینہ ساتھی ہیں ۔ انھوں نے جامعہ عثمانیہ سے پبلک

ایڈمنسٹریشن میں پوسٹ گریجویشن کیا ہے ۔ اب بحیثیت لائبریرین اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش میں کارگزار ہیں ۔ خواجہ ناظم الدین سلیم جنھیں باغ و بہار صحیفہ نگار کہنا چاہیے اور جو کافی عرصے سے امریکہ میں مقیم ہیں ۔ شکیل احمد خاں اس ادارہ سے وابستہ ہونے کے بعد راست تقرر کے ذریعہ P.I.B. میں ایک اہم عہدے پر فائز ہیں ۔ عزیز احمد سے کون ہے جو واقف نہیں ہوگا ۔ وہ نیوز ایجنسی ، اخبارات ، ریڈیو ، ٹی وی ، میں ہر جگہ نمایاں نظر آتے ہیں ان دنوں بلٹز جیسے معروف جریدے کے حیدرآباد میں نمائندہ اور اس کے علاوہ اور نہ جانے کیا کیا ہیں ۔

جناب سید داؤد اشرف صاحب سے ملاقات اس وقت سے ہے جب کہ یہ صرف ایم ۔ اے (اردو) تھے اور اپنی قابلیت اور ملازمت کے بل بوتے ایجاب و قبول کے مبارک وقت کا انتظار کر رہے تھے اب کامیاب زندگی کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ کامیاب ادبی اور تاریخی کارناموں کا ریکارڈ لیے حیدرآباد میں جگنو کی طرح جگمگاتے پھرتے ہیں ۔ مجھ جیسے کاہل کو عثمانیہ یونیورسٹی سے بی ۔ اے اور ایم ۔ اے کی اسنادات دلوانے کے لئے جس خلوص سے قیمتی وقت ضائع فرمایا ہے ، اس سے ان کو میری زندگی میں روایتی گرو کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے ۔ ڈاکٹر سید داؤد اشرف کی ایک کتاب " حاصل تحقیق " کی رسم اجراء (۵ / ستمبر ۹۲) کے

سلسلے میں کنوینر کے فرائض میں ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کے ساتھ مجھ ناچیز کو بھی شامل کیا گیا تھا۔

یعقوب میراں مجتہدی صاحب نے ڈاکٹر سید داؤد اشرف کے اعزاز میں ایک خیر مقدمی تقریب کا اپنے مکان میں اہتمام کیا تھا۔ اس موقعہ پر میں نے مناسب جانا کہ خیر مقدمی تقریب، رسم اجراء " حاصل تحقیق " کے فوری بعد منعقد کی گئی ہے اس لئے کیوں نہ کنوینر رسم اجراء جناب مصطفےٰ کمال کے بارے میں مضمون پڑھا جائے جبکہ اس تقریب کے سلسلے میں میں ان کا معاون کار رہا ہوں چنانچہ میں نے ایک مزاحیہ مضمون " مصطفیٰ کمال اول درجہ کا کنوینر " سنایا ڈاکٹر داؤد اشرف صاحب نے اس مضمون کو بہت پسند کیا اور کہا " تمہارے اب تک لکھے گئے مضامین میں آج کا مضمون بہت خوب ہے " اس طرح ان کے ردّ عمل کی برف پگھلی جس کے لئے میں ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

جناب احمد عادل صاحب: ان سے ملیے یہ وہ شخصیت ہے جس کو چاہنے والے اس کہاوت پر یقین رکھتے ہیں

کھیلیں گے کودیں گے تو ہوں گے نواب\
پڑھینگے لکھینگے تو ہوں گے خراب

جس طرح آج کے دور میں کہاوت اور ضرب المثل کے معنیٰ اور مفہوم یکسر بدل گئے ہیں مثلاً چراغ تلے اندھیرا کے بجائے اب بلب اوپر اندھیرا ہوگیا ہے اسی طرح کھیل کود کے نتائج آج کل بہت اچھے نکل رہے ہیں آج کا کھلاڑی نام اور شہرت کے ساتھ ساتھ مال اور دولت بھی بٹور رہا ہے اور بعض صورتوں میں سابق عالمی شہرت یافتہ کھلاڑیوں کو مالیہ فراہم کرنے کی پیش کش بھی کررہا ہے میری مراد کیپٹن اظہر الدین کی طرف سے سابق کیپٹن پٹوڈی کو دی گئی پیش کش سے ہے

احمد عادل صاحب نے عین جوانی میں کھیلنے سے زیادہ کودنے کی تعلیم اور تربیت کالج آف ایجوکیشن سے حاصل کی ہے یہ اپنی زندگی میں لاتعداد معصوم تعلیم پانے والے بچوں کو ورغلا کر گھر اسکول اور لائبریریوں سے باہر میدانوں کی چلچلاتی دھوپ میں ڈھکیلتے رہے ہیں اور ساتھ ساتھ ان بچوں کی تعریف کے پل باندھ کر ان کو خوش فہمی اور خوابوں کی دنیا میں گم ہونے چھوڑ بھی دیتے ہیں۔ بچوں کو خوب کھلانے کے لئے ان کے ہاتھ میں جادو کا ڈنڈا نہیں بلکہ روزنامہ " سیاست " کا اسپورٹس کالم موجود تھا یہ برسہا برس روزنامہ " سیاست " میں اسپورٹس رپورٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے کھلاڑیوں کے اچھے مظاہرے پر تعریف کے پل ہوا میں باندھتے تھے اور کمزور کھلاڑیوں کی ہمت افزائی اس طرح کی جاتی تھی کہ

بیشتر کھلاڑی میدانوں سے کھیل کے ختم ہونے کے بعد گھر لوٹنا بھول جاتے اور کھیل کے میدان پر ہی بسیرا کرنے کو ترجیح دیتے تاکہ دوسرے دن کھیل میں حصہ لے سکیں۔ ان سے میری دوستی ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ

دوست دوست نہ رہا

پیار پیار نہ رہا

اس قماش کے دوست سے کیا یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ میرے مضامین کے تعلق سے صحیح رائے دے سکیں گے ہر وقت انکا یہ جملہ یاد آتا ہے "تیرے اندر جو صلاحیتیں موجود ہیں انکو بغیر Ceasarian کے باہر لانا چاہیے" بہر حال اس امید کے ساتھ ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ یہ مشورہ نہ دیں ، کہ ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر مضامین لکھنے کی بجائے چلچلاتی دھوپ میں میدان میں بیٹھ کر لکھنا مناسب ہوگا۔

مظہر الزماں خاں میرے ہنایت قریبی دوستوں میں سے ہیں یہ افسانہ نگار کی حیثیت سے ہندوپاک ہی ہنیں بلکہ اردو دنیا میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں انکے افسانوں کی اشاعت کو مدیران رسائل اپنے لئیے اعزاز تصور کرتے ہیں انکی فراخدلی کی حد یہ ہیکہ وہ میرے مضامین سن کر داد دیتے ہیں اور حیدرآباد کے چند مزاح نگاروں کے ادب سے ان کا معیار اونچا

بتلاتے ہیں ۔ موصوف کی رائے سے محترم قاری کی رائے کے ٹکرانے پر نتیجہ ظاہر ہوگا ۔ میں مظہر الزماں خاں صاحب کا جو ایک شریف النفس انسان بھی ہیں تہہ دل سے شکر گزار ہوں ۔

جناب مصطفےٰ کمال صاحب سے میری ملاقات بھارت نیوز سروس میں ہوئی ۔ ان کا تعارف اس وقت یہ ہوا کہ آپ مجلس اتحاد المسلمین اور بھارت نیوز سروس سے وابستہ ہو کر کالج اور حیدرآباد میں بھارت نیوز کے ابھرتے ہوئے صحفیہ نگار ہیں بھارت نیوز اور چندر سری واستو صاحب کی رفاقت میں انھیں پھلنے پھولنے کا بہت زیادہ موقع حاصل ہوا ۔ ان کی محنت اور لگن سے متاثر ہو کر انھیں گولڈ میڈل بھی عطا کیا گیا ۔

آپ نے اپنی محنت اور لگن سے ترقی کرتے ہوئے حیدرآباد میں ایک منفرد مقام بنالیا ہے ۔ میرے مضامین سن کر مسکراتے ہیں لیکن شگوفہ میں شائع کرنا مناسب ہنیں سمجھتے کیونکہ شگوفہ کا معیار گھٹتا ہوا برداشت ہنیں ہوتا ۔

مارچ ۸۹ء میں بہ عنوان " واہ " ناچیز کا مضمون شگوفہ میں شائع ہوا اس پر ہندوستان سے زیادہ بیرون ہند سے بے حساب تعریفی مراسلے وصول ہوئے جس پر ایک ہنگامہ کھڑا ہوا اس حیرت ناک شہرت پر پہلی مرتبہ شگوفہ کی مجلس مشاورت اور مجلس ادارت دونوں ایک ساتھ طلب کی

گئی اور بہ اتفاق آرا یہ طے کیا گیا کہ میر فاروق علی کے نام کو اس پرچہ میں کہیں فٹ کیا جائے پھر ناچیز کا نام Manager کی حیثیت سے رکھا گیا اس پر دوبارہ پھر ہنگامہ کھڑا ہوا ، کہ مزاحیہ پرچہ میں مزاحیہ ادیب کو ادارت صدارت یا مشاورت میں رکھنے کے بجائے دفتریت میں شامل رکھنا خود شگوفہ کے معیار کو گھٹانا ہے معاملے کی گمبھیرتا کو دیکھتے ہوئے نام کو بغیر نوٹس خارج کر دیا گیا بہر حال ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب کی ذہانت کی داد دیتا ہوں کہ انھوں نے ایک مضمون کی اشاعت کے بعد ہی شکریہ وصول کرنے کی کھڑکی بند کر دی اور ساتھ ہی ساتھ شگوفہ کا دریچہ جدید ادب کے ڈکشن میں ناچیز کے لئے "گونگا دریچہ ، بہرہ دریچہ اور نابینا دریچہ " بن کے رہ گیا۔

ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مجھ جیسے سرے اور پائے کے مزاح نگار کو زندہ دلان حیدرآباد کی ادبی محفلوں میں سیدھے کھڑے ہوکر باآواز بلند پڑھنے کا موقع کیوں نہیں دیا گیا شاید زندہ دلان حیدرآباد کے منتظمین کی مجبوری یہ رہی ہیکہ حکومت نے جلسہ گاہ میں میڈیکل کیمپ قایم کرنے سے معذرت چاہی ان کا خیال یہ ہیکہ فاروق علی کے مضامین سننے کے بعد لوٹ پوٹ ہونا اور پیٹ میں بل پڑ جانے کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں - اگر شرکاء کے لئے طبی امداد فراہم نہ کی جائے تو ادارے پر حرف آسکتا ہے۔

جناب مضطر مجاز

دین اور دنیا کی تعلیم سے مالا مال اردو، فارسی اور انگریزی پر عبور رکھنے والی محترم شخصیت، (مضطر مجاز) شاعر مترجم اقبال اور ادیب کی حیثیت سے مشرق سے مغرب تک جانی پہچانی جاتی ہے۔ حال ہی میں لندن اور امریکہ میں اپنا تازہ اور باسی کلام سنا کر داد حاصل کرنے کے بعد واپس ہوئے ہیں۔ مجھ کو محترم کی ادبی سرپرستی حاصل ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت کے سلسلے میں زبان اور بیان کی درستگی اور داغ دوزی کتاب سے اس کی اشاعت تک ان کی رہنمائی کے علاوہ انھوں نے میری اس "VIRGIN" غیر شادی شدہ کتاب پر مقدمہ نگاری (خطبہ، نکاح) کا فریضہ بھی ادا کیا ہے جس کے لئے میں ان کا احسان مند ہوں۔

آخر میں، میں ان گنت کرم فرماؤں، مشفقوں اور مہربانوں کا بھی ممنون کرم ہوں جنھوں نے وقت بے وقت میری تحریروں کو سن کر میری حوصلہ افزائی کی۔

دورہ

دورے قسم قسم کے ہوتے ہیں ۔ ایک تو وہ جو لوگوں پر پڑتے ہیں یعنی مرگی کے دورے، ہچکی کے دورے، ہنسی کے دورے، پاگل پن کے دورے، اداسی کے دورے، شاعری کے دورے عشق کے دورے وغیرہ وغیرہ اور دوسرے وہ جن پر صاحب لوگ اکثر روانہ ہوتے ہیں ----- سڑکوں پر اکثر لوگوں کو بے ہوش پڑا ہوا دیکھ کر ہاتھوں کے طوطے اڑتے رہے ہیں اور یہ جان کر دل اور بھی دکھ جاتا کہ اس بچارے کا علاج سوائے جوتا سونگھانے کے اور کوئی نہیں ہے کیونکہ اسے مرگی کا دورہ پڑا ہے لیکن پھر علاج کے بعد بے ہوش نوجوان اٹھ کر اپنے کاروبار میں لگ جاتا تو ہم اطمینان کی سانس لینے لگتے ۔ ویسے اطمینان کی سانس لینے کے تو ہم بچپن ہی سے عادی ہیں لیکن جیسے جیسے ہوش سنبھالا اور اچھے برے کی پہچان ہونے لگی تو وقتاً فوقتاً سانس الجھنے لگی ۔ بہرحال مرگی کے مریضوں کو دیکھ کر پتہ چلا کہ دورہ بھی ایک مرض ہے جس سے خدا سب

کو بچائے رکھے ۔

کچھ عرصہ بعد اچانک ہمیں چلو بھر پانی کی ضرورت محسوس ہوئی ہوا یہ کہ ہم اپنے محلہ کے ساتھیوں کے ساتھ ڈسٹرکٹ ملیریا آفس پہنچے تو پتہ چلا کہ صاحب دفتر دورہ پر ہیں اچانک ہم نے بوکھلا کر پوچھا کیا صاحب دوروں کے مریض ہیں چپراسی نے ہنایت برہمی سے ہماری طرف دیکھ کر کہا دورہ یعنی صاحب ، TOUR پر ہیں ۔ بے شک ہم دوروں کی قسموں سے واقف ہنیں تھے چنانچہ ہمیں ہنایت شرمندگی ہوئی ---

بہرحال اب ہم دوروں کی دو قسموں سے واقف ہو چکے تھے ۔ پہلی قسم کے تصور ہی سے ہم کانپ اٹھتے ہیں اور دوسری قسم کا شوق بڑھتا جارہا تھا کہ کاش ہم بھی دورے کرتے، کچھ عرصہ بعد ہم سرکاری ملازم ہوگئے لیکن پھر بھی دورہ ہمارے لئے شجر ممنوعہ ہی رہا ۔ دوروں سے ہمارا تعلق اس حد تک ہی رہا کہ صاحب کے دورہ پر جانے سے پہلے ان کے پروگرام اور آنے کے بعد ٹور نوٹس ایک بدہئیت فائل میں نتھی کرتے جائیں ---

دورہ کنندہ عہدیدار ہم سے بہت ہی محبت اور شفقت سے ملتے تھے ۔ پھر اچانک یہ ہوا کہ دوروں کی تمنا تو دل ہی میں رہی لیکن کھانسی کے دورے پڑنے لگے ۔ رات دن کھانسنا اور دوا اور انجکشن کی مدد سے اطمینان کا سانس لینا ہمارا معمول ہوگیا ۔ یہ سلسلہ تقریباً دو تین ماہ چلتا رہا

اس اثناء میں اچانک دن کے دس گیارہ بجے تھے کہ گھر کے دروازے پر دستک ہوئی ۔ پتہ چلا کہ ہمارے دوست جن کا قد پانچ فیٹ ہے ، آئے ہوئے ہیں ۔ موصوف اداکاری کے ہنایت شوقین ہیں لیکن قد کے مختصر ہونے کی وجہ سے آج تک ہیرو ہنیں بن سکے ۔ ہم نے معمول کے مطابق کھانستے ہوئے ان کا استقبال کیا ۔ انھوں نے انتہائی خوشی کے عالم میں ایک آرڈر ہمارے ہاتھوں میں تھمادیا ۔ یہ سب انسپکٹر اکسائز کی حیثیت سے ہمارے اپائنٹمنٹ کا آرڈر تھا لیکن اتفاق کی بات دیکھئے کہ ہم ان احکام پر کھل کر خوش بھی ہنیں ہوسکے ۔ کیونکہ ہم سانس لینے کے جس تجربے سے دوچار تھے وہ ہم کو اس قسم کی کسی خوشی کی اجازت ہنیں دیتا تھا ۔ بہرحال جوں توں کرکے ہم نے ان احکام کو پلنگ کے بازو تپائی پر دواؤں کے بیچ رکھ دیا ۔ ہمارے دوست نے حسب معمول خوشی کا اظہار کیا اور ہماری سانس کے اکھاوے پر دکھ کی اداکاری کے جوہر دکھاکر چلتے بنے ۔ کچھ ہی عرصہ بعد ہم اس دورے سے گزر کر پھر سے بھلے چنگے ہوگئے اور گھر سے نکل کر سیدھے کپڑے کی دوکان پر پہنچے ۔ دوکان دار نے جو ہم سے کچھ واقف تھا مسکرا کر استقبال کیا اور قسم قسم کے کپڑے ہمارے سامنے پھیلادیئے ۔ ہم نے فوراً اسے روک دیا دل ہی دل میں اسے ایک ڈانٹ پلائی کہ اب ہم کالج الیکشن کے نعرے لکھنے والے اور سڑکوں پر

پتھر پھینکنے والے طالب علم نہیں رہے ہیں آفس میں فائلس کو صبح میں الماری میں ٹیبل پر اور پانچ بجنے سے پہلے ٹیبل پر سے الماری میں رکھ دینے والے کلرک بابو نہیں رہے ہیں اب ہم وردی پہننے والے آفیسر ہیں اور بہ آواز بلند خاکی کپڑے کی فرمائش کی، پہلے تو وہ کچھ سمجھ نہیں پایا کہ یہ کیا انقلاب ہے کل تک تو دھاریوں والی قمیص کے شوقین کو یہ کیا دورہ پڑا ہے - پھر ہم نے اس کو سمجھایا کہ ہم کو یونیفارم کا کپڑا چاہیئے ---- صاحب آپ اور ---- ؟ کیا مطلب ؟ ---- " پتہ نہیں تمھیں کہ ہم انسپکٹر ہوگئے ہیں!" اس مسکراہٹ میں کون سے معنی پوشیدہ تھے اور اس طرح ہم اپنی کھڑکھڑ کرتی وردی میں ملبوس تصور ہی تصور میں اپنے سینے کی چوڑائی پر اتراتے مستقبل کی سڑک پر پھیلے ہوئے دوروں کے تصور میں سرشار اور اپنے مقام مخصوصہ، معاف کیجئے مقام تعیناتی پر پہنچے اور بالآخر وہ دن آیا کہ ہمیں اپنے پہلے دورہ پر روانہ ہونا تھا ہم بس اسٹانڈ پر پہنچے اور یہ دیکھ کر ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ ہمارے جہاں دیدہ اور تجربہ کار کانسٹبل نے لپک کر سامنے والی دوکان سے ایک پرانی لیکن قابل استعمال کرسی کا بندوبست کرکے ہمیں عوام الناس سے قدرے علحدہ جگہ پر چھاؤں میں بٹھادیا - اب ہمارے اور ہمارے دوشیزہ دورے کے درمیان چند ہی منٹوں کا فاصلہ رہ گیا تھا - بس آئی ---- رکی ----

دروازہ کھلا ----- اور ہم اٹھے ----- بس میں سے ایک شخص برآمد ہوا ---- ہمارے جہاں دیدہ کانسٹبل نے فوراً لپک کر اس کی مزاج پرسی کی اور کشاں کشاں ہماری طرف لے آیا اور ہمیں اطلاع دی گئی کہ ایک آدھ گھنٹے کے بعد بڑے صاحب، دورے پر تشریف لا رہے ہیں چنانچہ اس طرح ہمارا پہلا دورہ ٹوٹ کر فضاء میں بکھر گیا اور ہم صاحب کے دورے کے انتظامات میں مصروف ہوگئے ۔

EAMCET عقلمند بیٹے اور ہوشیار باپ کا امتحان

جس طرح جنت میں پہنچنے کے لئے پل صراط سے گزرنا ضروری ہے اسی طرح آندھرا پردیش میں میڈیسن ، انجینیرینگ ، اگریکلچر، قانون وغیرہ کی جنت میں داخل ہونے کے لئے انٹرنس ٹسٹ کے پل صراط سے گزرنا ہوتا ہے ۔ خاص طور پر میڈیسن اور انجینیرینگ کے لئے تو اس پل پر ٹرافک کا مسئلہ پیدا ہوگیا ہے کیونکہ یہ پل آپ کو نہ صرف انجنیرینگ یا ڈاکٹری کی جنت میں پہنچاتا ہے جہاں آپ کے لئے گھوڑے جوڑے اور جہیز کے بیش بہا خزانے کی کھڑکیاں کھل جاتی ہیں یہ اور بات ہے کہ آپ انجینیر بن کے مستری کا کام کرتے رہیں یا ڈاکٹر بن کے امریکہ کے ہوٹلوں میں میزیں صاف کرتے رہیں ۔ یونیورسٹی کے زیر اثر کالجس میں جتنی نشستیں ہوتی ہیں ان میں داخلے ان ہی امیدواروں کے لئے ممکن ہیں جو قابل قدر نشانات کے ذریعے اعلیٰ Ranks میں جگہ حاصل کرتے

ں - امتحان میں Qualify ہونے کا معیار الگ مقرر کردیا گیا ہے اور Rank حاصل کرنے کے طریقے بھی راز میں رکھے جاتے ہیں -

جوں ہی ایمسٹ امتحان کے کنونیر کی جانب سے تمام Qualified میدواروں کی فہرست نتیجے کے طور پر شائع کردی جاتی ہے - تمام کو یفائیڈ امیدوار جنھوں نے رات دن محنت مشقت کی تھی اخبار میں اپنا ل نمبر دیکھ کر اخبار اپنے باپ کے ہاتھ میں تھمادیتے ہیں وہ امیدوار جو ت زیادہ نشانات پاتے ہیں وہ اور ان کے والدین مبارک بادیں رتے ہیں -

ان والدین کا امتحان اب شروع ہوتا ہے جن کے لڑکے صرف یفائی ہوئے ہیں اب باپ کو خاندان اور سماج میں مقام حاصل نے کے لئے اپنے امتحان کی تیاری شروع کرنی ہوتی ہے اور اپنے کمزور کو اونچے اور اعلیٰ مقام پر دیکھنے کی پدرانہ خواہش کے زیر اثر مالدار خانگی کالجوں کا رخ کرتا ہے خانگی کالجس اور خاص کر ---

Minori کے نام پر چلائے جانے والے کالجوں کے ارباب مجاز اپنے ں پر مظلومیت - اور معصومیت کے ملے جلے عجیب و غریب ت لئے اپنے دفتر کے سجے سجائے اجلاسوں میں بیٹھ کر Half D کے نیچے سے اس طرح شکار کی تلاش میں گھورتے رہتے ہیں جس

طرح King Fisher اپنے شکار کی تلاش میں تالاب اور جھیل کے کنارے کھڑا رہتا ہے۔

خانگی کالج کی ایک Society ہوتی ہے اور اس میں برائے نام اعزازی عہدے دار ضرور ہوتا ہے یہ عہدے دار سابق میں کئی سرکاری عہدوں پر فائزرہ کر محکمے میں کام کرنے والوں اور اس سے تعلق رکھنے والے عوام کو نت نئے انداز میں ایک سرکاری فکسڈ گرائنڈر میں گھمانے پھرانے کے بعد بالآخر وظیفہ، حسن خدمت پر علحدہ ہوتا ہے (جس میں حسن زیادہ اور خدمت کم ہوتی ہے) کوالیفائڈ بچے کا باپ دولت کے اڑن کھٹولے پر بیٹھ کر عہدیدار کے دفتر پہنچتا ہے تو وہاں موجود P.A. سے ملاقات ہوتی ہے جس کی حیثیت ڈورناب "Door Knob" کی ہوتی ہے مالدار باپ گردن اکڑا کر اور چہرے پر مصنوعی رعب کا ابٹن لیپ کر فخریہ انداز میں ایک سلپ پر اپنا نام اور مقصد ملاقات لکھ کر P.A. کے حوالے کردیتا ہے اور جیب میں پڑے سونے کے بسکٹوں کو کھنکھناتا رہتا ہے ۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ ایک بار عہدہ دار سے ملاقات ہوجائے تب عہدہ دار اور اس کے کالج کی نشست اس کے ہونہار بروا کی جیب میں ہوگی ادھر عہدیدار رات دن گھر پر اور دفتر میں اس فکر میں ڈوبا رہتا ہے کہ اس نے جو دعا یا پوجا کی تھی وہ قبول ہو کہ مالدار والدین کے بچے کم

نمبرات سے پاس ہوں یعنی صرف Qyalify ہوں تاکہ ان کے کالجوں میں داخلے کے لئے مجھ کو اور میری تخلیق کی ہوئی نشستیں خاص کر Minorities کے نام پر حکومت سے حاصل کی ہوئی نشستیں منہ بولے دام میں فروخت ہوں اور یہ تمنا بہر حال پوری ہوتی ہے۔

مالدار باپ کی سلپ جوں ہی عہدے دار کے ہاتھ میں جاتی ہے اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور چاہتا ہے کہ بہ نفس نفیس کرسی سے اٹھے اور باہر جاکر مالدار باپ کو خوش آمدید کہے لیکن یہ ایسا ہنیں کرتا، دل کو قابو میں رکھتے ہوئے کچھ دیر تاخیر کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ اور ان کی نشستیں باوقار طور پر فروخت ہوں اور یہ ظاہر نہ ہو کہ Minorities، Society کے نام پر یہ بک رہی ہیں۔

پھر اچانک Bell بجتی ہے فوراً .P.A اپنی کرسی سے اٹھتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ Pen اور Short Hand Book لیکر گرتے پڑتے عہدیدار صاحب کے اجلاس میں داخل ہوتا ہے جس سے ملاقاتیوں پر ایک قسم کا رعب پڑتا ہے۔ کچھ دیر بعد .P.A باہر آتا ہے اور مالدار باپ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے آپ اندر جاسکتے ہیں صاحب کا موڈ بہت اچھا ہے Best of Luck ۔ مالدار باپ اپنے کمزور بچے کے ہلکے نشانات کے ساتھ اپنی دولت کا وزن لئے داخل ہوتا ہے۔ مالدار باپ کو حیرت اس

وقت ہوتی ہے کہ عہدیدار صاحب داخل ہوتے ہی چند سوالات داغ دیتے ہیں اور سامنے پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھنے کے لئے تک نہیں کہتے۔ تب مالدار باپ کا دماغ تیزی سے کام کرتا ہے اور اپنے طور پر کالج میں اپنے بیٹے کے لئے نشست حاصل کرنے کے لئے بولی دینا شروع کرتا ہے اس پر منجھے ہوئے عہدیدار صاحب مطمئن نہیں ہوتے اور یہ کہتے ہیں کہ آپ سے معذرت چاہتا ہوں کیوں کہ آپ نے بہت دیر لگادی یہ نشستیں تو نتیجے سے پہلے ہی بک ہوچکی ہیں۔ یہ سن کر اس کا پہلے سے تھکا ماندہ دماغ کام کرنا بند کردیتا ہے کیونکہ نشستوں کی ایڈوانس بکنگ کا رواج سماج میں پتہ نہیں کب رائج ہوا ہے وہ سوچنے لگتا ہے کہ شاید مجھ کو چاہئیے تھا کہ بچے کو EAMCET کے امتحان میں بیٹھتے ہی خود اپنے امتحان کی بھی تیاری کرتا، تاکہ آج میں اور میرا لڑکا دونوں ایک ساتھ نشست حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے۔ تجربہ کار عہدیدار صاحب جب یہ دیکھتے ہیں کہ مالدار باپ کچھ گہری سوچ میں پڑگیا ہے تو انھیں اپنی دعا قبول ہوتی محسوس ہوتی ہے اور وہ اس کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے دو چار دن کے بعد کی ایک تاریخ اور وقت بغرض ملاقات دیتے ہیں اور بہت ہی خوش اخلاقی سے کہتے ہیں کہ آپ مجھ سے دوبارہ ملئیے میں آپ کے لئے ضرور کچھ کروں گا بورڈ کی ایک میٹنگ آج کل میں ہونے والی ہے اس کے

بعد اگر ممکن ہوسکے تو آپ کے لڑکے کے لئے ضرور نشست دی جائے گی مگر اس بات کا خاص رکھئیے کہ یہ بات راز میں رہے Donation یا Capitation fees کا جو Quotation آپ نے دیا ہے وہ معیار کے مطابق نہیں ہے ۔ مالدار باپ جو بدحواس ہوچکا تھا اطمینان کا سانس لیتا ہے اور Quotation پر نظرثانی کا وعدہ کرکے پھر ایک بار معنی خیز انداز میں خود پر اور کمزور لڑکے پر احسان کی اپیل کرتے ہوئے اجلاس سے رخصت ہوتا ہے اب عہدے دار صاحب اس امیدوار کا نام اور اس کے باپ کا دیا ہوا Figure اپنی خاص ڈائری میں نوٹ کرلیتے ہیں تاکہ اس کے بعد آنے والے Figures کو Tally کیا جائے اور List کو Finalise کرنے میں مدد ملے اس طرح نیک کام کا چکر پورا ہوتا ہے اور Minorities اطمینان کا سانس لیتی ہیں کہ ایسے عہدے دار نہ ہوتے جن کے سینوں میں ملت کا اتنا غم ہے تو غریب ملت کا حشر کیا ہوتا!

مصروفیت

جس دن سے ہوش سنبھالا ہے بزرگوں اور استادوں، خیر خواہوں، دوستوں اور دشمنوں سبھی کو کام کے قصیدے پڑھتے سنا ہے ویسے جہاں تک ہماری ریسرچ کا تعلق ہے کائنات کی سب سے مصروف شخصیت شیطان کی رہی ہے ورنہ فرشتے تو صرف عبادت کیا کرتے ہیں اور اگر حضرت انسان کو کسی نے زندگی کی مخصوص ڈگر سے ہٹ کر کسی کام پہ اکسایا تو یہ شیطان ہی تھا ورنہ گندم والی حماقت کے بعد حضرت انسان کچھ اس طرح کام میں بتلا ہوئے کہ قیامت تک چھٹکارے کی کوئی امید باقی ہنیں رہی۔

کام کئی طرح کے ہوتے ہیں پانی بھرنے سے لے کر پانی بھروانے تک سب کے سب کام ہی کہلاتے ہیں اچھا بھی کام ہوتا ہے اور برا بھی، کام بہر حال کام ہی ہوتا ہے۔ ورک مین (کام کا آدمی) سے لے کر ورک مینجر تک ہر ایک سے ہم بخوبی واقف ہیں یہ سب لوگ کام پر لگے رہتے

ہیں پہلی قسم کے لوگ کام کرتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگ کام کرواتے ہیں لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ کرنے اور کروانے کے باوجود کام اپنی جگہ ویسے ہی برقرار رہتا ہے جیسے ہر جاندار کے پیٹ میں بھوک۔

بھوک انسان کو چند مخصوص حالات میں محسوس نہیں ہوتی اور نتیجے میں انسان اپنی صحت کا کچھ حصہ گنوا بھی دیتا ہے ورنہ بھوک مٹانے کے لئے انسان مرغ وماہی تو کس شمار میں ہیں سانپ کھیکڑے اور مینڈک تک کھا جاتا ہے۔

کام کی بات کرتے کرتے ہم بھوک اور بھوک مٹانے کی بات کرنے لگے تو ہم کو ایک ایسی شخصیت کی یاد آرہی ہے جس سے ہم برسہا برس سے واقف ہیں جس کے لئے بھوک مٹانا تو نہایت ابتدائی مرحلہ ہے یہاں تو آنتوں میں تہہ در تہہ جمانے کے بعد بھی دوسروں کی جیب پر نظر رہتی ہے اور جیسا کہ سنتے آئے ہیں۔ تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ ہم دعوے سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ صاحب قیامت کی بھوک رکھتے ہیں۔

کام کی بات کرتے کرتے ہم بھوک اور بھوکوں کا ذکر لے بیٹھے۔ کام کرنے والوں کی تعریف اکثریوں کی جاتی ہے " مرزا کام دل لگا کر کرتے ہیں " ۔ شیخ صاحب بہت محنت سے کام کرتے ہیں، کاتب صاحب قلم جما کر لکھتے یا کام کرتے ہیں، کمال بہت سلیقے سے کام کرتے ہیں لیکن ہم

اس سلسلے میں عجیب واقع ہوئے ہیں ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کام کو کوئی بھی محنت، سلیقہ اور دل لگا کر نہیں کرتا بلکہ وقت جس طرح سب پر قادر ہے اس طرح کام بھی سبھوں سے سلیقہ، محنت اور دلجوئی سے اپنے آپ کو کروالیتا ہے اگر کام کی مرضی کے مطابق کام نہیں کرپاتے تو کام اس طرح پچھاڑتا ہے کہ دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں۔

کام ایک پیر تسمہ پا ہے جو کسی کا پیچھا نہیں چھوڑتا اکثر ایسی مثالیں نظروں کے سامنے آتی ہیں کہ اکثر لوگ اچھے خاصے کام پر لگے ہوتے ہیں لیکن پھر اچانک اس کام کو حقیر سمجھ کر اسے ایک دم نظر انداز کرنا شروع کردیتے ہیں اور پھر اسے اس طرح بھول جاتے ہیں جیسے کوئی اپنے غریب رشتہ دار کو تو پھر کام اپنا انتقام لینے کے لئے ایسے حضرت کے ہاتھوں میں جھاڑو تک تھمادیتا ہے اور پھر بھی کام اپنا کام ان سے لیتا رہتا ہے بس یہ ثابت ہوا کہ کام خود انسان سے اپنے آپ کو کرواتا ہے ۔

مصروفیات میں مطالعے کو بہت اہمیت حاصل ہے۔حصول تعلیم کے ابتدائی دور سے گذرنے کے بعد نام نہاد ماہرین تعلیم دوسرے اعلیٰ تعلیم پانے والوں کے لئے بے حساب کتابوں کا مطالعہ کرکے چند سو صفحات پر مشتمل، جس میں حوالوں کے صفحات زیادہ ہوتے ہیں کتابیں لکھتے اور دوسروں کو فلاسفی کی ڈگریوں کے حصول کے قابل بناتے ہیں

اور یہ بھی کام کی ایک قسم ہوتی ہے ۔ مطالعے کے ذکر پر چند اصحاب یاد آرہے ہیں جن کا ذکر یہاں مناسب ہوگا ۔ ایک صاحب مطالعے کے لئے اپنی جائز آمدنی کا اچھا خاصہ حصہ خرچ کر کے مختلف کتابیں ، رسالے وغیرہ خرید کر پڑھتے ہیں جب بھی ہم ان کو کوئی نئی چیز خریدتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہم کو مسرت سی ہوتی ہے اور اس لکھنے والے پر رشک بھی آتا ہے اور ایک لمحے کے لئے افسوس بھی ہوتا ہے چلو آج راست نہ سہی بالواسطہ ہی سہی بہرحال لکھنے والا بک رہا ہے (یہاں یہ بات واضح رہے کہ کتاب کی قیمت ہدیے کی شکل میں ہنیں ہوتی بلکہ بہ قیمت ہوتی ہے اس لئے بکنے کا تصور واضح ہوجاتا ہے) ایک اور صاحب ہیں جو نیک محنتی اور ساتھ ہی ساتھ ایمان دار واقع ہوئے ہیں اور ان کی ملازمت کتابوں ریکارڈ اور مخطوطات میں ڈوب جانے اور ان میں سے کچھ نہ کچھ ٹٹول کر نکالنے پر مشتمل ہے ان کو اکثر ہم نے اس عالم ٹٹول میں پسینہ ہوتے دیکھا ہے وہ ہر شام تھکے ماندے مگر اپنے آپ سے خوش اور اپنے کام سے مطمئن نظر آتے ہیں ایک اور صاحب ہیں جو بہت پڑھے لکھے اور نامی گرامی ہیں اور دولت ان کے قدموں میں لوٹتی ہے لیکن اکثر ان کو اخبارات مانگ کر پڑھتے دیکھا ہے ۔

بہرحال کام کی قدر اور اس کو اہمیت دینے والے بے حساب

اشخاص ایسے ملیں گے جنہوں نے چھوٹے اور بڑے کام کے فرق کو محسوس نہیں کیا اور کام کی قدر کر کے محنت کرتے ہوئے کہیں درجہ سوم کی اہلکارانہ خدمت سے بڑی بڑی خدمات پر پہنچ گئے تو کہیں چھ آنے کی مزدوری کرتے ہوئے بھی کام سے محبت کر کے بے تاج بادشاہ بن بیٹھے۔

ہو سکتا ہے کہ اس مضمون کو پڑھتے ہوئے آپ کے کام سے تھکے ہوئے بھیجے میں یہ سوال ابھرے کہ کیا لکھنے والے کو دوسرا کام نہیں ملا تھا جو وہ یہ بے کار کا کام لے بیٹھا تو جواب اس کا یہ ہے کہ معترضین وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے موجودہ کام کی اہمیت سے خود بہ خود واقف ہو جائیں گے۔

کرسی، کرسی اور کرسی

کرسی کی ہئیت بھی آج کے ترقی یافتہ دور میں بدل چکی ہے ۔ جس طرح چراغ تلے اندھیرا والی بات پرانی ہوچکی ہے اور آج کے سائنسی دور میں اندھیرا بلب اوپر ہوگیا ہے اسی طرح چار ٹانگوں والی کرسی کی ہئیت ارتقاء کے منازل طئے کرتے ہوئے Revolving Chair یعنی ایک ٹانگ پر کھڑی ہونے اور گھومنے والی Chair ہوگئی ہے ۔ چار ٹانگوں والی کرسی یا ایک ٹانگ والی کرسی جب تیار ہوجاتی ہے یعنی جب استعمال کے لئے بنتی ہے یا بنی بنائی کرسی خالی ہوجاتی ہے تو کیسے کیسے لوگوں کی نظریں اس پر پڑتی ہیں ۔

ہم اپنے بچپن میں سنا کرتے تھے کہ "آسمان کے تارے ہاتھ نہیں آتے ۔ کرسی ایک اہم شئے ہے جو ہر ایرے غیرے کو نصیب نہیں ہوتی" لیکن وقت وقت کی بات ہے آج ہر ایرے غیرے کو بھی کرسی نصیب ہوجاتی ہے ۔ اس پر طرہ یہ کہ ایسے لوگ عام طور پر کرسی پر بیٹھ کر

اداکاری کے کچھ ایسے جوہر دکھاتے ہیں کہ جس کی وجہ سے وہ یہ سمجھتے ہیں بدنام ہوں گے تو کیا نام نہیں ہوگا۔

اس جمہوری دور میں آنجہانی پنڈت جواہر لعل نہرو سابق وزیر اعظم ہند کا یہ قول یاد آرہا ہے کہ " وہ دن جمہوریت کا آخری دن ہوگا جب کہ پارلیمنٹ میں Opposition کی کرسی خالی ہوگی " تو جناب سمجھ لیجئیے کہ جمہوری دور میں کرسیوں پر جمے ہوئے حضرات سے اگر کچھ غلطیاں یا بھیانک غلطیاں سرزد ہوتی ہیں یا وہ من مانی کرتے جاتے ہیں تب Opposition نکتہ چینی کرتی ہے تو کم اہل اشخاص جو کرسیوں کو کسی طرح حاصل کرچکے ہوں چمٹے رہنے کے لئے ۔۔اچھے اور برے کارنامے دکھانے میں سبقت لے جاتے ہیں ایسے ہی لوگ بظاہر کرسی کو چھوڑ دینے کی باتیں بھی کرتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کرسی سے چمٹا ہوا موزوں یا غیر موزوں انسان جو بھی فیصلہ کرتا ہے اس کا وہی ذمہ دار ہوتا ہے اور ان فیصلوں پر نام بھی کماتا ہے یا بدنامی اور رسوائی کا سامنا کرتا ہے ۔ جب یہ ذمہ داری کے ساتھ فیصلے کرتا ہے تو اس قسم کی غیر ذمہ داری کی بات جو دھمکیوں اور استعفوں کی ہوتی ہے کہاں تک درست ہو سکتی ہے ۔ یقین ہو چکا ہے کہ اس قسم کی باتیں وہ نہیں کہتا بلکہ اس کے حواری اس سے

کہلواتے ہوں گے ۔ حواریوں کی بات آئی تو ہم کو یاد آرہا ہے یہ حواری بہت خاص چیز ہوتے ہیں ہم کئی ایسے لوگوں کو جانتے ہیں اور برسوں سے دیکھ رہے ہیں ساتھ ساتھ ان کی خوبیوں اور صلاحیتوں سے بھی واقف ہیں لیکن یہ جب اپنے سے چھوٹے سائز کے لوگوں کی مدح سرائی پر اتر آتے ہیں تو پھر اچانک یہ راز کھلتا ہے کہ یہ سب کچھ کرسی کروا رہی ہے ۔

بات کرسی کی تھی ہم کرسی کا طواف کرنے والوں کا ذکر لے بیٹھے ہماری ابتدائی دور کی ملازمت کا ایک حقیقی واقعہ ہے ہمارے دفتر کے ایک گزیٹیڈ آفیسر تھے اور چند Independent Officer جو Non - Gazetted تھے باقی کی ٹیم منتظم، محاسب اور اہلکاروں پر مشتمل تھی ۔ اس دفتر کے گزیٹیڈ آفسر اعلیٰ جو Last grade وہ Gazetted تھے وہ ایک نہایت محنتی، نیک، ایماندار اور باصلاحیت انسان تھے ۔ ان کی صحت بھی ماشاءاللہ بہت اچھی تھی ان کو اور ان کے کام کی پھرتی کو دیکھ کر عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا ۔ بہرحال وہ چند ماہ بعد وظیفہء حسن خدمت پر علحدہ ہونے والے تھے ان کے علحدہ ہونے سے ایک ڈیڑھ ماہ قبل ایک Non - Gazetted Officer بھی وظیفے کے لئے اپنی مدت ملازمت مکمل کرنے والے تھے ان دونوں کے جنھوں نے ایک ہی محکمہ میں ملازمت کی تھی تعلقات بہت اچھے تھے ایک

دوسرے کو بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کی طرح دیکھتے اور بھائیوں کی طرح رہتے تھے ۔ چھوٹے بھائی کو وظیفے سے قبل Gazetted Officer کی کرسی پر بیٹھنے کا شوق بہت تھا اور اس کے حاصل نہ ہونے کے بظاہر اثرات پر بہت دکھ تھا ۔ چھوٹے بھائی بڑے بھائی کو کسی طرح راضی کرکے رخصت ماقبل وظیفہ پر جانے تیار کرلیتے ہیں اب دیکھئے کہ کرسی کا چکر کس طرح چلتا ہے ۔ بڑے بھائی کی منظوری رخصت ماقبل وظیفہ اور اس کرسی پر ماموری کا مسئلہ جب ہیڈ آفس میں پیش ہوتا ہے تو اس فائل کو پر لگ جاتے ہیں اور جب فائل Circulate ہو کر (Head of the Department) کے پاس سے آتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ چھوٹے صاحب کو میٹرک پاس نہ ہونے کی بناء پر گزیٹیڈ بنانے کے لئے قانونی رکاوٹ درپیش ہے ۔

یہ جو ماقبل وظیفہ حسن خدمت کا ذکر آیا تو ہم کو ایک لطیفہ یاد آرہا ہے ۔ سر اکبر حیدری وزیر اعظم حیدرآباد جو اردو سے بہت زیادہ واقف نہیں تھے ان کے پاس اردو میں فائلیں پیش ہوا کرتی تھیں اور وہ ان کو پڑھ کر انگریزی میں تجاویز کیا کرتے تھے ایک دفعہ ایک فائل جو وظیفہ حسن خدمت سے تعلق رکھتی تھی پیش ہوئی تو انھوں نے حسن کو خوبصورتی کے معنوں میں لے کر کچھ اس طرح لکھ کر فائل واپس کردی

تھی ۔ " What is the Connection in Beauty and Service

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ گزیٹیڈ کرسی حاصل کرنے والے صاحب کے شہر میں ان کے ایک سے زاید پٹرول پمپس اور زیبنات ، مکانات تھے اور وہ خود ایک بہت بڑے بنگلے میں زندگی گزارتے تھے ۔ وہ روز دفتر کو ایک لمبی کار میں آیا جایا کرتے تھے ۔ خدا کا دیا سب کچھ ہونے کے باوجود ان پر کرسی سوار تھی اور وہ اسے بہر صورت حاصل کرنا چاہتے تھے

فائل واپس کردی گئی ۔ اس شرارت کے پیچھے ایک دوسرے امیدوار نکلے جواب تک چھپ کر وار کررہے تھے ۔ بہر حال بات یہاں تک پہنچتی ہے اور آپس میں تکرار ہوجاتی ہے ۔ پہلے امید وار پنجاب یونیورسٹی کے اسنادات پیش کرتے ہیں اور اس میں انگریزی کا پرچہ بھی شامل ہوتا ہے جو وہ پاس کرچکے تھے اس کا معیار میٹرک ہی نہیں بلکہ Intermediate ہوتا ہے اور کچھ دنوں بعد ان کو چند ماہ کے لئے Gazetted Chair مل جاتی ہے جو ایک حد تک زندگی بھر کی محنت اور اچھا کارنامہ رکھنے کا صلہ تھا لیکن بعض کرسیاں کارناموں اور صلاحیتوں کی قائل نہیں ہوتیں ۔

میٹرک کا ذکر آیا تو ہم آپ پر واضح کردیں کہ میٹرک ابتداء میں

چھوٹی کرسی کی پہلی اور اہم شرط سمجھی جاتی تھی جہاں تک ہماری یاد داشت کا تعلق ہے 1964ء تک ایک ایسا امتحان یا Selection ہوتا تھا جس میں پاس ہونے پر میٹرک کے بورڈ اگزامنیشن میں بیٹھنے کی اجازت دی جاتی تھی ۔ جو بھی اس Selection میں ناکام ہوجاتے ان کو بورڈ کے امتحان میں شرکت سے محروم کردیا جاتا تھا ۔ دس سال مسلسل امتحانات Selection سلکشن اور بورڈ امتحان پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے جاتے یا چھوٹی چھوٹی کرسیوں پر مامور ہوجاتے ۔

کرسی ، کرسی اور کرسی یعنی کئی کرسیوں کے سلکشن کا ایک واقعہ پیش خدمت ہے ایک قدیم درس گاہ کے اولڈ بوائز کی میٹنگ ہورہی تھی اس درس گاہ کو بجا طور پر فخر حاصل تھا کہ یہاں سے فارغ تحصیل ہونے والے بیشتر طلباء نے اس دور میں نمایاں کرسیاں حاصل کی تھیں ان میں آل انڈیا سروس کی کرسیوں سے لے کر عوامی رہنمائی کی وزارت تک ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹی تھی ۔ اس میٹنگ میں شرکت کے لئے اخباری اطلاع کے ذریعہ اولڈ بوائز سے درخواست کی گئی تھی ۔ اولڈ بوائز کی صف میں ایک ایسی بھی شخصیت موجود تھی جو صحافت سے تعلق رکھتی تھی ۔ ان کا ریکارڈ یہ تھا کہ یہ میٹرک میں کئی مرتبہ ناکام ہوچکے تھے ان دنوں شہر میں یہ بات مقولہ بن چکی تھی کہ " میٹرک پاس کرلیا وہ بھی

سات اقساط میں"

میٹرک کا امتحان 7 سات مضامین پر مشتمل ہوا کرتا تھا اس اعتبار سے یہ مقولہ درست تھا اور ان پر پوری طرح صادق آتا تھا ان کی تعلیم یہاں تک ہی پختہ ہو کر رہ گئی تھی۔

اب جناب یہ کرسیاں مختلف رنگ روپ میں بٹی ہوئی تھیں مثلاً صدر کرسی، نائب صدر کرسی، معتمد عمومی کرسی، معتمد کرسی اور خازن کرسی اور ساتھ ساتھ کام کی کرسی اور نمائشی کرسی ۔ ان تمام کے سلکشن اور تقسیم کا وقت آتا ہے تو جناب بڑی بڑی ذمہ دار شخصیتوں کی نظر ایک مخصوص لباس میں بیٹھے ہوئے شخص پر پڑتی ہے اور آپس میں کانا پھوسی شروع ہو جاتی ہے اگر اس صحافی کو نظر انداز کر دیں تو وہ اپنے اخبار کے صفحات ہماری اس میٹنگ کی روداد میں خامیاں نکال کر اور روز مرہ کی زندگی کے Common Error سے اخبار کے کالموں کو بھر کر ہماری پگڑی اچھالنے کی ناکام کوشش کرے گا۔ اس ڈر سے مصلحت کو کام میں لاتے ہوئے سات اقساط والے صاحب کو جبھی "بلا مقابلہ" ایک کرسی پیش کر دی جاتی ہے

بہر حال یہ ثابت ہوا کہ کبھی کبھی لوگوں کے قد تو وہی رہتے ہیں لیکن وہ کرسی کے Size کی مناسبت سے دیکھنے والے کو چھوٹے بڑے

نظر آتے ہیں ۔ مثلاً ایک چھوٹا آدمی بہت بڑی کرسی پر بیٹھ کر اس طرح غائب ہو جاتا ہے جیسے کھٹمل ۔ اور کبھی کبھی جب بیٹھنے والے کا قد کرسی سے بڑا ہوتا ہے تو یا تو کرسی نظر نہیں آتی یا ٹوٹ جاتی ہے اور لوگ کبھی کبھی اپنی ٹوٹی ہوئی کرسیوں کے جنازے کندھوں پر اٹھائے اور ماضی کی الٹی سیدھی یادوں کو اپنے سینے سے لگائے بے نام مستقبل کے اندھیرے میں کھو جاتے ہیں ۔

نہ مانے بڑوں کی ریت
گھر گھر مانگے بھیک

اگر معزز قارئین اس عنوان کی ساخت پر غور کر کے طنزیہ انداز میں مسکرانے کی کوشش کریں تو میں ان کی اس طنزیہ مسکراہٹ کا رخ یقیناً اپنے بزرگوں کی طرف موڑنے کی گستاخی کروں گا۔ اس لئے کہ دکھنی زبان کی اس کہاوت کی پیدائش کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ہمارا حافظہ کمزور اور Vocabulary نام کی کوئی چیز نہ ہونے کے باوجود بھی یہ دکھنی کہاوت ہم کو بچپن ہی سے یاد ہے۔ یہ بات ان پر صادق آتی ہے جو بڑوں کی بات نہ ماننے کے لئے ہی پیدا ہوئے ہیں لیکن ہم بڑوں کی بات مانتے ضرور ہیں کچھ باتیں آدھی اور کچھ ساری کی ساری اسی لئے شاید ہم بھیک مانگنے سے بچ گئے (خدا کا شکر ہے)۔

ہم کھاتے پیتے کسی گھرانے سے تعلق ہنیں رکھتے پھر بھی ہم کو چھوٹی چھوٹی سہولتوں سے خدانے سرفراز کیا ہے۔ بچپن میں ہم کو عربی پڑھنے کے لئے مسجد کو صبح اور شام جانا پڑتا تھا۔ صبح تو خیر ہم جاتے لیکن شام میں اس وقت جاتے جب ہمارے والد محترم دفتر سے مکان لوٹتے ہوئے نظر آتے۔ جاتے اس لئے کہ والد محترم کی مارپٹائی سے بچ سکیں لیکن وہاں دیر سے جانے پر مولوی صاحب سے مار کھاتے اس طرح بڑوں کی بات نہ ماننے سے آج تک ہم عربی پڑھ کر مطلب ہنیں سمجھ سکتے۔

ہم ذارلاپرواہ قسم کے ہوتے جارہے تھے زندگی کے دن اس طرح گزر رہے تھے جس طرح فلم میں لمحے، کیلنڈر پر لکھی تاریخ میں اور تاریخیں مہینوں اور پھر برسوں میں بدلتی جاتی ہیں۔ پھر اچانک یہ ہوا کہ ہم عام قسم کے ذہین لڑکوں کی طرح میٹرک کا امتحان پاس نہ کرسکے پہلی بار جب ہم میٹرک میں فیل ہوئے تو خاندان کی جانی مانی شخصیتوں نے یہ سمجھا کہ ہم بیکار ہیں جبکہ ہم دوبارہ امتحان کی تیاری میں دن رات مصروف ہوچکے تھے ایک عزیزہ نے تو اپنے شوہر سے کہہ کر ہم کو کام پر لگوادیا چنانچہ ہم میونسپلٹی میں ٹیکس کے بلوں پر "ٹک" مارنے کے اہم فرض کو انجام دینے میں مصروف ہوگئے اور خوش اس لئے تھے کہ یہ " پروفیشنل ٹیکس کے بلس ہوتے تھے جن کی وجہ سے کئی لوگوں کی نیندیں

حرام ہوتی تھیں ۔ معاوضہ ہم کو اصل تنخواہ کی بجائے گرانی الاؤنس کے برابر ملتا تھا ۔ دودھ پر کی ملائی تو ہر دور میں مشہور اور ساتھ ہی بدنام رہی ہے لیکن صرف تنخواہ پر کا گرانی الاؤنس کسی طرح بہتر نہ تھا اس لئے ہماری نظریں دوسری ملازمتوں کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں بڑوں کا کہا مان کر محنت سے پڑھتے اور میٹرک کا امتحان کامیاب کرلیتے تو شاید ملازمت ایسی ملتی جس کا معاوضہ تنخواہ جمع گرانی الاؤنس ہوتا ۔

دوران تعلیم ہمارے بزرگوں کے علاوہ اساتذہ اکثر نصیحت کیا کرتے تھے کہ محنت اور دل لگا کر پڑھا کرو ۔ محنت سے تو پڑھتے ہی تھے مگر دل لگا کر پڑھنے والی بات کچھ جچی ہنیں اسی وجہ سے شاید ہم پہلی بار فیل ہوگئے ۔

آپ جانتے ہیں تالی ایک ہاتھ سے ہنیں بجتی امتحان میں فیل ہونے کی ذمہ داری صرف ہمارے سر ہنیں تھی بلکہ ہمارے اساتذہ کا بھی اس میں برابر کا نہ سہی تھوڑا بہت ہاتھ ضرور تھا ہم کو یاد آرہا ہے کہ جب ہم نے اعلیٰ ثانوی جماعت میں قدم رکھا تھا تو تاریخ کے ایک استاد نے پہلے دن تاریخ کی کلاس میں تاریخ اور اس کی جڑواں بہن جغرافیہ کی بجائے جنرل لکچر دیا تھا ۔ اور اس بات کو ذہین نشیں کروانے کی جان توڑ کوشش کی تھی کہ پیسہ کمانے کے لئے پڑھائی لکھائی کے علاوہ بہت

سارے ذرائع موجود ہیں اور اگر پڑھ لکھ کر پیسہ کمانا چاہو تو مخصوص راستوں پر دشواری کے بغیر بھی پیسہ کمایا جاسکتا ہے۔ لیکن غم اسی کا ہے کہ نہ استاد کے مشورے پر ٹھیک سے عمل کرسکے اور نہ ہسٹری نے ہماری یادداشت کا ساتھ دیا۔ چنانچہ سوائے رانا سانگا کے نام کے اور کچھ یاد نہیں رہا۔ وہ بھی اس لئے کہ اس نام میں عجیب سی موسیقیت تھی۔

ہم بہرحال لوٹ پوٹ کے میٹرک پاس ہوگئے اور ایوننگ کالج میں داخلہ بھی مل ہی گیا اور ساتھ ہی ساتھ ایک مقامی اخبار کے دفتر میں کام بھی کرنے لگے۔ اپنی تعلیمی حالت کے ایماندارانہ اور فراخدلانہ اظہار کے بعد ہمیں یقین ہے کہ کچھ لوگ چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر دل ہی دل میں طنزیہ انداز میں سوچنے کی کوشش بہرحال کریں گے کہ یہ علمی سطح اور صحافت ۔۔۔!! تو ان بے خبر حضرات کی اطلاع کے لئے جو اردو اخبارات پڑھ کے ان سے مرعوب رہتے ہیں یہ بتانا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ اردو صحافت کے لئے ہماری علمی استعداد سے زیادہ بلند سطح خطرناک بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ ہم جو نہ صرف اردو اخبار بلکہ ایک نیوز ایجنسی کی والینٹیری کا تجربہ بھی رکھتے ہیں، یہ بتانے کے موقف میں ہیں کہ دو تین درجن، انتقال، استقبالیہ جلوسوں، عرس اور صدارتی خطبوں کے سرمائے کے ساتھ اردو نیوز ایجنسی چلائی جاسکتی ہے اور ایسی ہی دو تین

نیوز ایجنسیوں کے فراہم کردہ مواد کے ساتھ ایک اخبار بھی شائع کیا جاسکتا ہے۔ جس کے اداریوں کو پڑھنے کی خود ایڈیٹر کو توفیق نہیں ہوتی۔ یہاں ہمیں نہایت عقیدت کے ساتھ ان بزرگ ورکنگ جرنلسٹ صاحب کی وہ دلچسپ حرکت یاد آرہی ہے جب انھوں نے ایسے ہی ایک موقر جریدہ میں تنخواہ کے سلسلے میں مسلسل ٹھگائے جانے کے بعد خاموشی سے کام چھوڑ دیا تھا لیکن جانے سے پہلے ایڈیٹر کے خلاف ایک نہایت چبھتا ہوا گالی نامہ اداریئے کے طور پر لکھ گئے تھے جسے ایڈیٹر نے تین چار دن کے بعد اس وقت ہجے کرکے پڑھا جب کسی نسبتاً زیادہ پڑھے لکھے دوست نے توجہ دلائی اور پھر کئی دن ورکنگ جرنلسٹ کو غائبانہ گالیاں دیتے رہے۔ کام بہت عزت کا تھا۔ یہاں پر معاوضے میں تنخواہ تھی اور نہ ہی گرانی الاؤنس۔ کام عزت کا تھا اس لئے عزت کے سہارے ہم زندگی گزارنے لگے اور اسی عزت میں مگن کالج سے بھی اکثر غیر حاضر ہوجایا کرتے، یہاں تک کہ تعلیم سے قوم کا درد رکھنے والے سر سید اور ان کی خدمات سے واقف ہوچکے تھے اور کوئی ایسی امید باقی نہیں تھی کہ اب سر سید جیسا انسان پیدا ہوگا۔ پھر اچانک یہ ہوا کہ صرف اور صرف ہمارے لئے ایک چھوٹا سر سید پیدا ہوا۔ ہم حسب معمول بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے اور ساتھ ساتھ گپ شپ میں محو تھے۔ اسے دیکھ کر اس دفتر پر

آنے والے ایک سینئیر ساتھی نے ایک زوردار لکچر دے دیا - ان کے لب ولہجے کی سختی پر بھی ہم نے چپ سادھ لی یہ ہمارے ہی دل گردہ کا کام تھا کیونکہ ان دنوں ہماری مصروفیات میں اخبار کے دفتر میں کام بغیر معاوضہ کے ، کالج میں پڑھنا بغیر معاوضے کے اور ورزش کرنا بغیر معاوضہ کے شامل تھا اور ان دنوں اگر ہم پر کوئی غیر ضروری رعب جتانے کی کوشش کرتا تو ہم اس کی گردن پر سوار ہوجاتے - چنانچہ ہم کو ہمارے دوست احباب خنجر کے نام سے مخاطب کرنے لگے تھے -

ان کا کہنا تھا کہ ہم کو چاہئیے کہ ہم کالج پابندی سے جائیں محنت اور دل لگا کر پڑھیں اور آگے چل کر انھیں نہ صرف ہمارے لازمی مضامین بلکہ اختیاری مضامین تک سے ربط پیدا ہوگیا جو ایک حد تک ناواجبی بات تھی - لازمی مضامین پر خیر خواہوں کا اختیار بھلے ہی چلتا ہو - اختیاری مضامین تو بہر حال ہمارے اختیاری تھے چنانچہ وہ بہنایت خلوص سے ہمارے بھیجے کی سنگلاخ زمین کی آبیاری کرنے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ کالج کی حاضری ختم ہوگئی یہ مطمئین اور ہم خوش - تعلیم جاری رہی - ہمارا شعور دراصل حیدرآباد کے اس تاریخی دور سے گزر رہا تھا جب معززین بلدہ کے چشم وچراغ کتابوں میں سر کھپانے کے نامعقول مشغلے کی بجائے " چیٹنگ " کی نئی سائنس میں مہارت پیدا کررہے تھے چنانچہ

ہوا یہی کہ ہم چھوٹی چھوٹی چھٹیوں کے زینوں پہ قدم رکھتے آگے بڑھتے رہے اور ممتحن کو شکست فاش سے دوچار کرتے رہے اور کیونکہ یہ کام بھی ہم نے بڑوں کی نصیحت کے مطابق دل لگا کے کیا تھا اس لئے اس کا پھل اچھا ہی ملا اور ہمیں یقین ہے کہ حالات نے ساتھ دیا اور بزرگوں کی دعائیں شامل حال رہیں تو وہ دن دور نہیں ہے جب ہم بھی اس شہر کی روز مرہ زندگی میں سماجی، تہذیبی یا ثقافتی سفیر کا روپ دھار لیں۔

انگریزی کی روٹی اور اردو کے گن

روزگار ایک نہایت ہی اہم اور نازک مسئلہ ہے جس کا تعلق طنز ومزاح سے پیدا کرنا یا اس کو افسانوی شکل دینا صرف اور صرف نقاد یا نامور مزاح نگار کے بس کی بات ہوگی ورنہ ایک حماقت ہی نہیں بلکہ برائی سمجھی جائے گی۔

اگر پیٹ بھرے شخص سے دریافت کیا جائے کہ روزگار کیا چیز ہے اور بے روزگاری کس چڑیا کا نام ہے تو غیر سنجیدہ انداز میں کچھ یوں کہے گا کہ " روزگار روزگار ہے اور بیروزگاری بیروزگاری " پھر اچانک تھوڑا سا سنجیدہ ہو کر یوں کہے گا کہ روزگار، اچھا روزگار، روزگار کی تلاش وغیرہ ان تمام کے تعلق سے میری معلومات اتنی وسیع ہیں کہ بیان کرنے کے لئے ایک سے زیادہ نشستیں درکار ہوں گی ۔ لیکن بیروزگاری کا ذکر کرتے ہوئے میری ٹانگیں ہی نہیں بلکہ میری روح کانپنے لگتی ہے بعض

صورتوں میں تو خدا کا حصول آسان اور روزگار کا حصول مشکل نظر آتا ہے کیونکہ ایک جگہ بیٹھ کر عبادت میں لگ جائیں تو خدا مل جائے گا اور روز گار در بدر کی تلاش پر بھی مشکل نظر آتا ہے ۔ اس طرح ایسے مقابلوں میں کبھی خدا تو کبھی روزگار (انداز فکر پر منحصر ہے) کا نتیجہ فوٹو فنش کے ذریعہ نکلتا ہے ۔ اور اس نتیجے میں کبھی خدا تو کبھی روزگار آگے نکل جاتا ہے ۔ ایسا شخص جس کو فوٹو فنش کی مدد سے روزگار حاصل ہوتا ہے تو اس کا رجحان خدا کی طرف کم ہو جاتا ہے اور وہ شخص جو خدا کی طرف سے روزگار حاصل کرتا ہے وہ ساری زندگی خدا اور روزگار دونوں کو مضبوطی سے تھامے ہوئے زندگی گذار دیتا ہے ۔

دوسرے دوست نے ان باتوں کو سن کر مداخلت کرتے ہوئے کہا "یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے خدا نے رزق کا وعدہ کیا ہے اور وہ ہر صورت رزق دیتا ہے کیا اس کہاوت سے جو ایک اٹل حقیقت ہے تم واقف نہیں خدا بھوکا اٹھاتا ہے بھوکا سلاتا نہیں"

جناب نعیم زبیری صاحب نے اپنے روزگار کی شروعات میں اردو کی روٹی یعنی صحافت کو پسند کیا اور اردو کی روٹی اور ذائقے کے لئے چٹنی سے پیٹ کی آگ پر قابو پاتے ہوئے اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے لیکن کھڑے کھڑے ہی ترقی کر گئے اور انگریزی کی روٹی کھانے لگے یعنی فوڈ

ڈپارٹمنٹ میں ملازم ہوگئے ملازمت کے فرائض یہ تھے کہ گیہوں اور شکر کے دانے گن کر تھیلیوں میں بھروانا - یہ عمل چاہے اردو میں کیا جائے لیکن رجسٹر میں اندراجات انگریزی میں لکھنا اور اس کی اطلاع دفتر بالا کو مراسلے کے ذریعے ہو یا تختہ جات کے ذریعے ہو انگریزی میں روانہ کرنا اور پابندی اس پر یہ کہ شکر کا دانہ زبان پر نہ رکھا جائے اگر رکھے ہوتے تو شکر زبان پر رکھنے کا معمول بن جاتا اور ان ملازمین کی فہرست میں شامل ہوجاتے جن کی فہرست شکر خور سے ترقی کرتے ہوئے معمول خور بن جانے والوں میں ہوتی - یہ اس لعنت سے بچے رہے اور یہ اردو کے حقیقی نمک خوار زندگی بھر شکر خور بن نہ سکے - کھاتے انگریزی کی اور گاتے اردو کی- میری مراد ان کی افسانہ نگاری کی طرف ہے جو آج ہندوپاک ہی نہیں بلکہ اردو دنیا میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہے - جناب نعیم زبیری صاحب کی تحریر میں جو جادو ہے اس کو بیان کرنا نہایت ہی مشکل کام ہے مثال کے طور پر" زرد زرد دھوپ" پر محترمہ جیلانی بانو اور عوض سعید صاحب کے تبصرے کو فہرست میں " دو باتیں " کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے - میری نظر میں یہ دو باتیں نہیں ہو سکتیں کیونکہ جہاں تک باتوں کا تعلق ہے ایک خاتون اور اس پر عالمی شہرت یافتہ خاتون اور دوسروں کے لئے ہی سہی کم گو عوض سعید صاحب کی باتیں اور اس پر

ان"دو باتیں" اس سے واضح طور پر جناب نعیم زبیری صاحب کی ذہانت
ن نظر آتی ہے۔
" نعیم زبیری حیدرآباد کے ان اہم افسانہ نگاروں میں شامل ہیں
وں نے کم لکھا مگر بہت اچھا لکھا" انھوں نے اردو شہروں کے مشہور
اہوں اور اخبارات کے ادبی کالموں پر کھڑے ہو کر اپنے اچھے افسانہ
۔ ہونے کا چلّا چلّا کر کبھی اعلان ہنیں کیا اور وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ کام
بران جرائد اور پبلیشرس کا ہے کہ اچھی تخلیقات حاصل کر کے قاری
ٹ پہنچائیں ۔ مدیران جرائد کو یہ بھی سہولت حاصل ہے کہ اچھی
یقات مال مفت اور مال مسروقہ کے عنوان سے بلا خوف و خطر
ئین تک پہنچائیں ۔ مدیران جرائد اور پبلیشرس کی کوتاہیوں کی وجہ
، جناب نعیم زبیری صاحب کے اچھے افسانے اردو کے لاتعداد قاریوں
ب پہنچ نہ سکے ۔ یہ تو اچھا ہوا کہ ۱۸/ نومبر 1993 کی شام نمائش میدان
ڈاکٹر سید داؤد اشرف صاحب نے جناب نعیم زبیری صاحب کی شخصیت
۔ ان کی افسانہ نگاری پر بھرپور روشنی ڈالی اور حیدرآباد کی بڑی علمی
اور ادبی شخصیتوں کی موجودگی میں جناب نعیم زبیری صاحب کو جو
ب ذہین اور باخبر افسانہ نگار ہیں ایک بار پھر متعارف کروایا۔

مصطفےٰ کمال ۔ اول درجے کا کنوینر

جناب مصطفےٰ کمال سے کب، کہاں اور کس وقت ملاقات ہوئی تھی یاد نہیں ۔ اس کی دو معقول وجوہات ہو سکتی ہیں ۔ ایک وجہ تو حافظے کی کمزوری اور دوسری وجہ کمال صاحب سے ملاقات کو کوئی اہم واقعہ نہ سمجھنا ایک عرصہ گزر جانے کے بعد اب جبکہ مصطفےٰ کمال ایک مخصوص دائرے میں ایک اہم شخصیت کے مالک ہو چکے ہیں تو ملال ہوتا ہے کہ کیوں ہم نے اس اہم لمحہ کو یاد نہیں رکھا ۔ ہو سکتا ہے 20 ، 25 سال قبل میری اور کمال صاحب کی سیکلیں راستے میں ٹکرا گئی ہوں ۔ ٹکرانے کی شاید وجہ یہ تھی کہ کمال صاحب کی سیکل کو بریک نہیں تھا ۔ ان دنوں شہر میں یہ بات مشہور تھی کہ یاقوت پورہ اور دبیر پورہ کے نوجوانوں کی سیکلوں میں بریک نہیں ہوا کرتے تھے ۔ پولیس اور شہر کے عوام نے بھی ان نوجوانوں کو چھوٹ دی رکھی تھی ۔ شاید ٹکرانے کے بعد دونوں نے ایک دوسرے پر رعب جمانے کے لئے بھارت نیوز سے

وابستگی کا ذکر کیا ہو اور دوستی کا ہاتھ بڑھ گیا ہو پھر بھی وہ مخصوص لمحہ یاد نہیں۔

جیسا کہ ہر ایک کو ترقی اور اپنی شناخت کی فکر رہتی ہے اسی طرح مصطفیٰ کمال صاحب نے بھی مجرد گاہ کے کمرہ نمبر ۱۷ بھارت نیوز سے ترقی کی آرزو و تمنا لئے بیچلر کوارٹرز کی دوسری منزل کمرہ نمبر ۲۷ فائن آرٹس کا رُخ کیا اور وہ فائن آرٹس پر زیادہ وقت گزارنے لگے فائن آرٹس کے فنکاروں کو یہ پتہ چلا کہ مصطفیٰ کمال نہ صرف اردو کے ایم اے ہیں بلکہ انھیں امتحان میں گولڈ میڈل حاصل کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اس کے علاوہ وہ جامعہ عثمانیہ میں دوران تعلیم ایک پرچے کی ادارت بھی انجام دے چکے ہیں اور ساتھ ہی بھارت نیوز میں کام بھی کیا ہے تو زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان "شگوفہ" کی ذمہ داری ان کے سر ڈال دی گئی اور زندہ دلوں نے تماشہ دیکھنا چاہا لیکن اوسط قد کا اول درجے کا فنکار اپنی صلاحیتوں سے اس پرچے کو پابندی سے شائع کرتا رہا اور ترقی کی منزلیں طئے کرتا ہوا اسی عمارت کی تیسری منزل کے کمرہ نمبر ۳۱ پر جا بیٹھا۔

مصطفیٰ کمال نے ملک کی مایہ ناز درس گاہ جامعہ عثمانیہ سے اردو سیکھی۔ بھارت نیوز سے وابستہ ہو کر اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ جس عمارت کی پہلی منزل سے زندگی کی ابتداء کی تھی اسی عمارت کی آخری

منزل پر پہنچ کر یہ ثابت کر دکھایا کہ محنت، لگن اور مصمم ارادے سے ہر کام کیا جاسکتا ہے چاہے وہ اردو کا مزاحیہ رسالہ ہی کیوں نہ پابندی سے نکالنا ہو۔ ماہنامہ شگوفہ ہندوستان اور پاکستان کا واحد طنز و مزاح کا رسالہ ہے اور اس کا معیار ہم سب پر روشن ہے وہ یہ کہ شگوفہ کو اس بلند مقام پر پہنچانے اور حاصل شدہ مقام کو برقرار رکھنے کے لئے مصطفی کمال اور صرف ڈاکٹر سید مصطفی کمال ہی کی شخصیت ذمہ دار ہے۔ اس اول درجے کی صلاحیتوں والے کمال سے کام لینا اور اردو کاز کو آگے بڑھانے میں ان کی خدمات سے استفادہ کرنا اب اردو والوں پر منحصر ہے۔

ڈاکٹر سید داؤد اشرف اسٹیٹ آرکائیوز کے انمول خزانے سے بڑی عرق ریزی کے ساتھ اہم موضوعات پر نیا مواد اکٹھا کر کے اپنے مضامین میں پیش کرتے ہیں۔ ان کو خیال آیا کہ ان کے مضامین جو روزنامہ سیاست میں نمایاں طور پر شائع ہو کر عالمی شہرت پا چکے ہیں انھیں کتابی شکل دی جائے تو انکی نظر اپنے دیرینہ ساتھی مصطفی کمال ایڈیٹر "شگوفہ" پر پڑی۔ انھوں نے گراں مایہ کتاب " حاصل تحقیق " کی کتابت سے لے کر چھپوائی تک اور حد تو یہ ہے کہ رسم اجراء تک ان کی خدمات حاصل کیں اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر سید داؤد اشرف صحیح شخصیت کے انتخاب میں مہارت رکھتے ہیں۔ اس کے وہ ان گنت لوگ گواہ ہیں جو

"حاصل تحقیق" کی رسم اجراء میں شریک تھے ۔ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال نے جس خوبی اور خلوص سے کنوینر کی حیثیت سے جلسے کی کاروائی چلائی اور ڈاکٹر سید داؤد اشرف کی صلاحیتوں ، کارناموں اور ان کے Family Background کا کھل کر تعارف کروایا اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صرف مزاحیہ رسالے کے مدیر اور اردو کے لکچرار ہی ہنیں بلکہ بہترین کنوینر اور اور ناظم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صاف ستھرے ذہن اور دل کے مالک بھی ہیں ۔

میں ڈاکٹر سید داؤد اشرف کو مبارکباد دیتا ہوں کہ ان کو اپنی گراں مایہ کتاب کی اشاعت ، رسم اجراء اور اس سلسلے میں منعقدہ انتہائی کامیاب جلسے کی کاراوئی چلانے کے لئے ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال جیسا کنوینر اور ناظم میسر ہوا ۔

آم کھاؤ کلام سناؤ

فی زمانہ شاعروں کی اقسام، آم کی اقسام کی طرح ان گنت ہیں جس طرح نعت گو شاعر، سنجیدہ شاعر، غزل گو شاعر، مزاحیہ شاعر اچھا خاصہ شاعر ہونے کے باوجود اپنے آپ کو شاعر تسلیم نہ کرنے والا شاعر (میری مراد جمیل احمد صاحب سے ہے جو جدہ سے حیدرآباد اور حیدرآباد سے جدہ کے سفر میں عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ صرف کر رہے ہیں) وغیرہ وغیرہ۔

جس طرح اچھے قسم کے آموں مثلاً حمایت۔ شکر گٹھلی۔ لنگڑا وغیرہ وغیرہ کا عام انسان کو نصیب ہونا مشکل ہے اسی طرح ادب سے دلچسپی رکھنے والے عام انسان کو اچھے شاعر کا کلام اس کی زبانی سننا بہت مشکل ہے بلکہ بعض صورتوں میں تو ناممکن ہوتا ہے۔

آم کا استعمال بھی مختلف ہے۔ آم کاٹ کر کھایا جاتا ہے آم کتر کر

کھایا جاتا ہے اور چوس کر کھایا جاتا ہے وہ آم جو چوس کر کھایا جاتا ہے اس کا تو جواب ہی نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ چوس کر کھانے میں جو لطف آتا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔

کسی بھی شاعر کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے دو طریقے ہیں ایک طریقہ کلام کا مطالعہ ہے اور دوسرا طریقہ شاعر کی زبانی کلام سننا۔ مطالعے سے شاعر کا زیادہ تر کلام ایک ہی نشست میں پڑھ لیا جاسکتا ہے اور لطف اندوز ہوا جاسکتا ہے لیکن شاعر کا کلام اسی کی زبانی سننے میں جو لطف ہے ویسا ہی آم کو چوس کر کھانے میں ہے اور شاید اس سے بھی بڑھ کر فرق صرف اتنا ہے کہ آم کا پورا مزہ لینے کے لئے اسے بھگونا پڑتا ہے اور شاعر کو بھگونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ویسے بعض شعراء اندر سے بھیگ کر کھلتے ہیں۔ دکھنی میں ایک ضرب المثل بھی ہے "کب تک چھپے گی کیری پتوں کی آڑ میں ایک نہ ایک دن آئے گی یاروں کی ڈاڑھ میں" کیری پتوں کی آڑ میں چھپ سکتی ہے لیکن جب وہ آم بن جاتی ہے تو پتوں اور ڈالیوں کو چھوڑ کر انسان کی مرغوب غذا بن کر اپنے آپ کو پیش کردیتی ہے اور اس طرح یہ انسان کی حقیقی ملکیت اور غذا بن جاتی ہے۔

اس ضمن میں ایک دو لطیفے پیش خدمت ہیں۔

ایک بزرگ خاتون نے ملاقات کے دوران جب جوشؔ کی خیریت دریافت کی تو موصوف نے کہا "آج راستہ میں بھیڑ بہت تھی آلو کا نرخ گھٹ رہا ہے۔ رات کی سردی اپنے عروج پر تھی" وغیرہ وغیرہ اور جب ان خاتون نے حیران ہو کر اس بے ربط گفتگو کا مطلب دریافت کیا تو جوشؔ صاحب نے فرمایا کہ وہ غزل کہہ رہے تھے۔

ایک اور لطیفہ

دوران سفر یونس سلیم نے جوشؔ ملیح آبادی سے پوچھا کہ کیا بات ہے آپ آج کل غزل لکھ تو نہیں رہے ہیں بلکہ اس کی مخالفت کر رہے ہیں حالانکہ ابتداء میں آپ خود بہترین غزلیں کہتے رہے ہیں۔ اس پر جوش نے جواب دیا کہ بچپن میں تو میں ننگا بھی رہا کرتا تھا۔

حیدرآباد کی ادبی دنیا کا بچہ بچہ یہ جانتا ہے کہ حیدرآباد کے نمائندہ شاعر مخدوم محی الدین صاحب مرحوم ایک رات اپنی تازہ غزل سنانے کے لئے سامع کی تلاش میں عابد روڈ پر آدھی رات تک چکر لگاتے رہے اور تھک ہار کر اورینٹ ہوٹل کے ایک بیرے کو پکڑ کر اپنی تازہ غزل سنانے لگے بیرے نے غزل سن کر داد کے عوض مخدوم صاحب سے کہا صاحب اب بہت چڑھ گئی گھر جاؤ۔

اسی طرح شاعر کا فن کیری کی طرح جبتک رہتا ہے وہ اپنے کلام کو

چھپائے رکھتا ہوگا اور بقول جوشؔ صاحب کلام بے ربط گفتگو کی طرح ہوتا ہے ۔ اگر بقول جوشؔ ہی کلام ننگا ہے تو چھپایا جاسکتا ہے ۔ لیکن کلام جب پک کر پختہ ہوجاتا ہے کلام بے ربط گفتگو اور ننگا نہیں ہوتا تو وہ کلام عوام کی ملکیت اور سرمایہ ہوتا ہے ، چھپ نہیں سکتا اور بہ بانگ دہل عوام پر ظاہر ہوتا ہے اور دلوں میں جگہ بناتا جاتا ہے ۔

مخدوم محی الدین صاحب مرحوم کو ایک اور دفعہ اپنی تازہ غزل سنانے کے لئے سامع مل نہ سکا تو اپنے محلے کے عبدالغفور صاحب کو جو سیکل ٹیکسی کی دکان کے مالک تھے پکڑ کر اپنا کلام سنانے لگے ، غفور صاحب نے داد کے عوض اپنا کلام مخدوم صاحب کو سنادیا ۔

اس اہم واقعے سے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ مخدوم صاحب درجہ دوم کے شاعر تھے اور اپنا کلام سنانے کے لئے بے چین تھے بلکہ ان کے اندر چھپا فن کار اپنی بات عوام تک پہنچانا چاہتا تھا ۔ چاہے وہ ہوٹل کا بیرا یا سیکل ٹیکسی کا مالک ہی کیوں نہ ہو ۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ سپاہی کی سپہ گری میدان جنگ میں ، اداکار کی اداکاری اسٹیج پر اور کھلاڑی کا کھیل میدان میں غرض یہ کہ فن کار کا فن جب تک عوام کے سامنے پیش نہیں ہوگا فن اور فنکار کی درجہ بندی تو رہی خود عوام کا ناقابل تلافی نقصان ہوتا ہے

کملاکر راؤ نائیڈو کمل ڈپٹی کمشنر اکسائز

بہ یک وقت عہدیدار، شاعر، ادیب اور دوست

شادی اور اسکے بعد بپا ہونے والی تقاریب کے التوا کی خبر پڑھ کر بعض مدعوئین کے اوپر جو گزرتی ہے اس سے وہی لوگ واقف ہیں جن کی زندگیوں میں ان دعوتوں کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو شاعروں کے لئے مشاعروں کی ہوتی ہے ۔ متعلقہ لوگوں پر جو صدمہ گذرتا ہے وہ اپنی جگہ ہے لیکن پیشہ ور مدعوئین کی زندگی میں ایک عجیب سا خلاء پیدا ہوجاتا ہے ہونٹوں تک آئی ہوئی نفیس بریانی کا یوں اچانک چھن جانا کتنا اندوہناک ہوتا ہے لیکن بعض تقاریب جنکی تیاریاں بڑے اہتمام سے کی جارہی ہوں اچانک ملتوی ہوجائیں تو مجھ جیسے بعض لوگوں کی پوزیشن بڑی نازک ہوجاتی ہے۔ مثلاً اگر آپ کو یہ پتہ چلے کہ آپ نے جس معزز عہدیدار کی وظیفۂ حسن خدمت پر سبکدوشی کے موقع پر جو تقریر نہایت عرق ریزی کے بعد تیار کی تھی اور آئینہ کے سامنے کھڑے ہوکر کہاں رکنا

ہے اور کہاں پڑھنا ہے کی پریکٹس بار بار کی تھی وہ رخصتی تقریب اچانک ملتوی ہوگئی ہے ۔ ویسے دنیا کو ابھی اپنی اس غلطی کا احساس پوری طرح نہیں ہوا کہ "ابھی تو میں جوان ہوں" کے بمصداق متعلقہ عہدے دار کا حسن خدمت ابھی اس منزل پر نہیں پہنچا کہ انھیں بزرگ تسلیم کیا جائے ۵۸ برس کی منزل ابھی نہیں آئی!! یہ خوشگوار صدمہ مجھے ۳۱ / جولائی ۱۹۹۲ کو ہوا جب پتہ چلا کہ عالی جناب کملاکر راؤ نائڈو کمل کی سرکاری عمر تو ۵۸ ہو چکی ہے لیکن وہ اپنی سرکاری تاریخ پیدائش کے بہت بعد پیدا ہوئے تھے ۔ اب یہ فیصلہ کہ وہ بزرگی کے کونسے اسٹیشن پر رکے ہوئے ہیں معزز عدالت کے ہاتھ میں ہے کیونکہ قدرت تو اپنا کام بہت پہلے کر چکی ہے اور اس طرح مقامی شاعر کی غزل، ادیب کی تحریر اور محکمہ جاتی لیڈر کی تقریر یک لخت منجمد ہوکر رہ گئی ۔ معقول وجہ یہ تھی کہ کچھ عرصے سے عالی جناب ، محبوب نگر میں منعقدہ ادبی محفلوں اور مشاعروں کی صدارت فرمارہے تھے اور اپنی شاعری ، تقریر اور مزاحیہ مضامین سے یہ ثابت کرچکے تھے کہ اردو ہندوستانیوں کی زبان ہے ۔ اردو کا مخصوص جادو ان پر بھی اثر کرچکا تھا ۔ محبوب نگر کے اردو والے ان کی اردو دلچسپی کے نتیجے میں گھر اور دفتر پر مسلسل ملتے یا یوں کہئیے کہ گھیرے رہنے لگے تھے ۔ اس لئے عالی جناب کی ۳۱ / جولائی ۱۹۹۲ء کو وظیفۂ حسن خدمت پر علحدگی کے

موقعے پر سارے مقامی شاعروں کی تازہ غزلیں، ادیبوں کی تازہ تحریریں اور لیڈروں کی تازہ تقریریں جو انھوں نے عالی جناب کی شان میں خراج ادا کرنے کے لئے لکھ اور سوچ رکھی تھیں یک لخت منجمد ہو کر رہ گئیں۔

میں انسپکٹر اکسائز کی حیثیت سے اگسٹ ۱۹۸۹ء میں کلوا کرتی عرق ڈپو کا جائزہ حاصل کرنے پر عالی جناب کی راست ماتحتی میں داخل ہوا اس سے پہلے صاحب موصوف سے غائبانہ تعارف تھا۔ ان کے چال وچلن عادات واطوار سے بھی کچھ کچھ واقف تھا اور خاص کر اس بات سے بہت اچھی طرح واقف تھا کہ وہ اپنے عہدے اور اختیارات کے استعمال میں مداخلت برداشت نہیں کرتے اور آج بھی کسی کے تبادلے یا ترقی میں کسی سینئیر آفیسر یا لیڈر کی ہرگز نہیں چلتی کیونکہ اپنی دوسری تعلیم یافتگی کے علاوہ آپ کے ہاں شراب دو آتشہ کے طور پر قانون کی پوسٹ گریجویٹ ڈگری بھی موجود ہے۔ چنانچہ وہ قانونی داؤ پیچ اور اختیارات کے استعمال سے خوب واقف ہیں۔ میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ آج کے دور میں جبکہ ایڈمنسٹریشن سے حقیقی ایڈمنسٹریشن بھاپ بن کر اڑتا جارہا ہے ایسی صلاحیتوں کے حامل تمام عہدیداروں کی تاریخ پیدائش بدل دینی چاہئیے کیونکہ آج کے عہدیداروں کے کندھے کمزور محسوس کر کے سیاسی مداخلت کار ان پر سوار ہو جاتے ہیں اور خمیازہ بھگتتے ہیں ماتحتین

خاص کر انسپکٹر اور سب انسپکٹر اکسائز کے لئے سرکاری ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ محکمہ کے اعلیٰ عہدیداروں کی عادات اور پسند ناپسند کی جانکاری بہت ضروری ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ وہ رات میں جب سوتے ہیں تو چت سوتے ہیں یا کروٹ سے یا پھر اوندھے سوتے ہیں۔ اسی طرح ان کا انتظام بھی کرنا پڑتا ہے۔ چت سونے کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کے ریوینیو کی وصولی اور محکمہ جاتی جرائم کو ختم کرنے کی فکر میں چھت کو گھورتے ہوئے نیند لگ جانا، کروٹ سونے کا مطلب ٹرانسسٹر سے خبریں اور فلمی گانے سنتے سنتے نیند لگ جانا اور اوندھا سونے کا مطلب دنیا خاص کر محکمہ کی ذمہ داریوں سے بے خبر ہو کر سو جانا ہے تاکہ ہو جائے جو ہوتا رہے۔ کھانے پینے سے لے کر سونے تک کا انتظام بہ حسن وخوبی کرنا تاکہ ماتحت کو نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ گذشتہ دہے کا واقعہ ہے کہ ایک ڈپٹی کمشنر اکسائز جن کا حلیہ ہنایت پاک وصاف اور عبادت گذاروں کی طرح ہوا کرتا تھا محبوب نگر کے دورے پر آکر رات محبوب نگر کے سرکاری بنگلے میں گذاری اور مچھروں نے انکی صفائی اور عبادت کو بالائے طاق رکھ کر تمام رات شائد کچھ زیادہ ہی خون چوس لیا۔ اس پر برہم ہو کر صاحب موصوف نہ صرف محبوب نگر کے سب انسپکٹر کا چند ماہ میں وقت سے پہلے نا اہلی اور بدانتظامی کی پاداش میں برائے نام محکمہ جاتی قانونی گرفت میں

لاکر تبادلہ کر دیا بلکہ اس کا ذکر مختلف مقامات پر اپنے مقدس دوروں کے موقعے پر کرتے بھی رہے ۔ اس بے چارے مچھروں کے کاٹے ہوئے سب انسپکٹر کا جو نقصان ہوا اس کے نتیجے میں وہ بھی انکے حق میں دعائیں دیتا ہے ۔

کملاکر راؤ نائیڈو کمل ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے مزاح نگار بھی ہیں ۔ ان کا ایک مضمون " ممتاز شخصیت " جو اسکول کے ایک دوست کا خاکہ ہے ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد میں ماہ / مارچ ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا ہے اس کے کچھ حصے ثبوت کے طور پر پیش ہیں ۔

" جہاں تک مجھے علم ہے میاں بیوی میں اتنی محبت تھی اور ہے بھی کہ دنیا رشک کرنے لگے شائد ان کے آلپسی خلوص کو دیکھ کر قدرت نے ممتاز کو چھ لڑکیوں سے سرفراز فرمایا " اور ایک جگہ اپنے دوست کی تنگدستی کو خاص طنزیہ انداز میں جس طرح پیش کیا ہے اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اردو تحریر خاص کر اردو طنز و مزاح پر کسی خاص فرقہ کا اجارہ ہنیں ہے بلکہ ہندوستانیوں کی بلالحاظ مذہب و ملت اپنی میراث ہے ۔

" شیشہ و تیشہ " کے پیش لفظ کی یہ تحریر مجھے یاد آتی ہے کہ " کسی مفکر کا قول ہے کہ ہندوستان کو مزاح کے بجائے طنز کی بہت زیادہ ضرورت ہے حسن اتفاق دیکھئے کہ وہ حسین مفکر میں ہی ہوں یہ قول میرا ہی ہے ۔ "

طنز نگاری ادب کی مشکل ترین صنف ہے ۔ نئے طنز نگاروں کی حوصلہ شکنی مطلوب نہیں ۔ اپنی بڑائی یا یوں کہئیے حوصلہ افزائی البتہ مقصود ہے ۔ اچھا طنز اچھے شعر کی طرح کم یاب بھی ہے اور نایاب بھی ۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کامیاب طنز نگار اور شاعر انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں اب صاحب موصوف کی اس تحریر کو ملاحظہ فرمائیے " ان باتوں سے ہٹ کر میرا خاص مشاہدہ رہا کہ وہ شیروانی جو کہ ممتاز نے اپنی ڈیوٹی پر چڑھنے کے بعد سلوائی تھی شادی میں وہی کام آئی اور کئی برسوں تک ان کے جسم سے چپکی رہی ۔ خود شیروانی کو ممتاز کے جسم سے شائد اتنا انس تھا کہ چھوڑنے کا نام نہ لیتی اور شاید شیروانی کو یہ خوف تھا کہ ایک بار ممتاز کے جسم سے چھوٹ گئی تو یقینا دوسری شیروانی سوکن بن کر آجائے گی اور یہ بڑی ناگوار بات ہوگی ۔ شیروانی کے اصل رنگ نے خیر باد کہدیا تو ممتاز نے اس کو ناسی رنگ میں رنگوایا اور پھر چند برسوں میں وہ رنگ بھی پھیکا پڑگیا اور بعض جگہ سوراخ پڑنے لگے تو نہایت ڈھنگ سے سلوا کر رفو کروا کے کالے رنگ میں رنگوادیا ۔ اب کیا تھا شیروانی کی وجہ سے ممتاز کا شباب پھر سے شباب پر آگیا تھا "

ان دنوں انسپکٹرس اور سب انسپکٹرس کی کم سے کم ماہ میں ایک میٹنگ ڈپٹی کمشنر صاحب کی جانب سے ضرور لی جاتی تھی ۔ چند ماہ سے

میں یہ دیکھ رہا تھا کہ صاحب موصوف کا چہرہ کچھ چھوٹا سا ہوگیا ہے ۔ لب کچھ پتلے پتلے اور ناک کی سائز بھی کچھ کم ۔ میٹنگ کے دوران مسکراتے تو کچھ کم عمری کی مسکراہٹ کا گمان ہوتا ۔ کسے گمان تھا کہ جیسے جیسے وقت گذرتا جارہا ہے ویسے موصوف کی عمر میں کمی آرہی ہے اور یہ کون جانتا تھا کہ صاحب موصوف عمر کے اعتبار سے وظیفہ کے لائق ہنیں ہوئے ۔

ایک خاص بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی تحریر کو ختم کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اکسائز آفسیرس میٹنگس جن کو صاحب موصوف کنڈکٹ Conduct کرتے آئے ہیں ان کے ایجنڈے میں مختلف قسم کے اسٹیٹمنٹس Statements ہوتے ہیں ۔ مثلاً

(1) Monthly Rentals of Toddy and Arrak

(2) Past Excise Arrears

(3) Consumption of Trees

(4) Crime Detection. اور بہت کچھ ۔ ان میٹنگس میں ضلع کے تمام انسپکٹرس اور سب انسپکٹرس موجود رہتے ہیں ۔ میٹنگ شروع ہوتی ہے ۔ انسپکٹرس جو سامنے والی کرسیوں پر بیٹھے ہوتے ہیں اپنی اپنی کارگذاریوں کی تفصیل پیش کرتے ہیں پھر اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے ۔ اگر کام اطمینان بخش ہو تو وہ لمحے ہنسی خوشی گذر جاتے ہیں اور اگر کسی کا

مظاہرہ ٹھیک نہ ہو تو صاحب کا موڈ خراب ہو جاتا ہے اور برہم ہو جاتے ہیں ۔ میٹنگ چلتی رہتی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ غصے کا اثر دوسرے انسپکٹرس پر نہیں پڑتا ۔ جس انسپکٹر پر برہم ہو چکے ہوتے ہیں اس کی باری جب کسی اور اسٹیٹمنٹ پر آتی ہے اور اس موضوع پر اس کی کارکردگی ٹھیک رہتی ہے تو اس کی بھرپور تعریف کرتے ہیں اور اس طرح اسکی سراہنا اور دلجوئی کی جاتی ہے کہ کچھ دیر پہلے ان کی ڈانٹ ڈپٹ سے دل شکستہ انسپکٹر ہنستا ہوا نظر آتا ہے یہ عجیب بات شاذو نادر ہی دیکھنے میں آتی ہے ورنہ " صاحب " کا موڈ اگر کسی پوائنٹ پر بگڑ جائے تو پھر آخر میں آنے والے کی جان بخشی کسی صورت میں نہیں ہوتی ۔

کملاکر راؤ نائیڈو مکمل گنگا جمنی تہذیب کے علمبرداروں میں سے ایک ہیں اور بہ یک وقت عہدیدار بھی ہیں ، شاعر ، ادیب اور دوست بھی ، اس لئے ماتحتین کو اس بات کی خوشی ہے کہ ان کی عمر عزیز ۵۸ سال کو نہیں پہنچی ہے تو نہ سہی ، وداعی نہ سہی ۔ کسی نہ کسی تقریب کی مٹھائی کسی بہانے تو کھانے کو ملیگی ہی ۔

میں ہنستے مسکراتے اور ساتھ ساتھ مختلف آرٹسٹوں کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں جیسے یہ ان کے قریبی دوست یا محبوبائیں ہوں۔

جب ان کی بیگم صاحب کو برداشت نہ ہوا تو انہوں نے دبے دبے الفاظ میں ایک دن نفسیات کے ڈاکٹر کے پاس جانے کی اپیل کی جس پر گھر میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا جس سے بیگم صاحب کو بڑی پریشانی ہوئی پھر یہ طے کیا گیا کے اسلم فرشوری کو کچھ عرصہ کے لئے Observation میں رکھا جائے اور خاص کر نیند کی حالت میں، جس سے اسلم فرشوری کو بڑا دکھ ہوا اور یہ ہر گز اس امتحان کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ آخر کار ہندوستانی ناری کی طرح موصوف کی شریک حیات بھی سمجھوتہ کر بیٹھیں۔

اسلم فرشوری صاحب سے میری پہلی ملاقات فائن آرٹس اکیڈیمی کے آس پاس ۱۹۶۸ء کے لگ بھگ ہوئی ۔ جن دنوں میں بھارت نیوز سروس میں رپورٹر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ ۱۹۷۰ء میں جناب قادر علی بیگ صاحب کی ہدایت میں ڈرامہ "برف کی مینار" جس میں اسلم فرشوری کا کردار بھی اہم تھا، رو ندرا بھارتی میں پیش کیا گیا جس کا میں کنوینر تھا۔ ان دنوں معظم جاہی مارکٹ میں واقع ہائی اسکول میں ریہرسل ہوا کرتی تھی میں بھی موجود رہتا۔ تب سے بے تکلفی بڑھ گئی اور آج تک اس میں کوئی ترقی یا کمی نہیں آئی ۔ میں اسلم فرشوری سے بے تکلف ہوں اور

قریب بھی یہ بات معذرت کیساتھ تو نہیں کہہ سکتا کہ موصوف پیدائشی فنکار ہیں یا نہیں بلکہ یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ Orignal Artist ہیں ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر آرٹسٹ ہیں تو کس قسم کے، کیونکہ آرٹسٹ کے بھی کئی اقسام ہوتے ہیں جو کسی خاص رول کے لئے فٹ ہوتے ہیں ۔ مثلاً ہیرو، ویلن، معاون اداکار Extras وغیرہ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ ایک ایسا فن کار ہے جس کی مثال ایک ایسے نگینہ کی سی ہے جس کو ہاتھ کی انگوٹھی میں جڑیں یا گلے کے ہار میں یا سر کے تاج میں یہ اپنی Originality کی وجہ سے اپنی چمک دمک ہر جگہ برقرار رکھتا ہے ۔ اور ہاتھ گلے اور تاج کی شان بڑھاتا ہے ۔ اسلم فرشوری حیدرآباد کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں نمایاں ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی اور تہذیبی محفلوں کی روح رواں بن گئے ہیں اور یہ روح ادبی تہذیبی محفلوں میں آئے گا آئے گا جیسے گانے گاتے ہوئے منڈلاتی نہیں ، بلکہ صحت مندروح کی طرح انہیں فائیدہ پہنچاتی ہے ۔ اب رہا اسلم فرشوری کی تاریخ پیدائش کا سوال ۔۔ تو اس کی کیا اہمیت ہے کہ وہ کب پیدا ہوئے سوال تو یہ ہے کہ ان کا پیدا ہونا اردو دنیا کے لئے ایک خوشگوار حادثہ تھا یا نہیں ۔ کیونکہ جھوٹے سرٹیفکٹ تو کئی ایک بنائے

جاسکتے ہیں لیکن وہ ٹھوس شخصیت جو اردو کی ہتذیبی اور ثقافتی دنیا میں ہلچل ڈالنے کے لئے پیدا ہوئی ، اس بات کا اثباتی جواب ہے کہ فائن آرٹس اکیڈیمی اور سیتہ ہنیں کتنے مقبول ہتذیبی ادارے ان کی پیدائش کے لئے قدرت کے مشکور ہیں ۔

شراب برائیوں کی جڑ

شراب -- بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ سب برائیوں کی جڑ! - برائیوں سے یہاں مراد انسانی کمزوریاں اور برائیاں بھی ہیں اور سماجی برائیاں اور لعنتیں بھی - ہر برائی اور لعنت اپنی جگہ فرد اور سماج کو نقصان پہنچاتی ہے مثال کے طور پر فضول خرچی فرد کو اور اسکے سارے خاندان کو متاثر کرتی ہے اس کی وجہ سے آمدنی اور خرچ میں توازن ہنیں رہتا فضول خرچی کی وجہ سے ایک فرد یا خاندان اپنی اہم اور بنیادی ضروریات کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے - بچوں کو اچھی تعلیم ہنیں دلوائی جا سکتی اچھی غذا کا انتظام ہنیں ہو سکتا اسی طرح اپنی اور خاندان کی صحت پر بھی مناسب توجہ ہنیں کی جا سکتی - سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فضول خرچی کا سب سے بڑا سبب کیا ہوتا ہے - میرے خیال میں فضول خرچی کا سب سے بڑا سبب پینے پلانے کی بری عادت ہے - ایک شخص اس عادت پر اپنی آمدنی کا وہ حصہ خرچ کر دیتا ہے جو وہ اپنی اور اپنے

خاندان کی ترجیحی ضروریات پر صرف کر سکتا تھا۔ پینے پر زیادہ مصارف ہونے کی وجہ سے وہ شخص اور اس کا خاندان مقروض ہو جاتا ہے۔ معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہونے کے بعد ایک فرد اور اس کے خاندان کو اپنی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے ناجائز طریقوں سے پیسہ حاصل کرنے کے لئے مجبور ہو جانا پڑتا ہے۔ دھوکہ دہی، فراڈ، جعلسازی اور وعدہ خلافی صرف چند برائیاں ہیں۔ مجبور ہونے کے بعد فرد اور خاندان اور بھی مختلف اقسام کے عیوب اور جرائم کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ نشہ کی وجہ سے برائیوں میں مبتلا ہونے اور جرائم کا ارتکاب کرنے کے واقعات عام ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نشہ کے بعد انسان ہوش کھو دیتا ہے اور جب ہوش و حواس کی حالت میں نہیں ہوتا تو اچھے برے کی تمیز نہیں رہتی۔ دن کے اجالے میں جو لوگ بغیر دھوئے اس گلاس میں پانی تک پینے کے روادار نہیں ہوتے جس سے کسی اور نے کچھ پیا ہو وہی نازک مزاج لوگ کیسے وہ بدبودار شراب اپنے حلق میں انڈیلتے نہیں ہچکچاتے۔

ایک لطیفہ مشہور ہے کہ ایک شخص سے جب اس کی عادات واطوار کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ مجھ میں ساری اچھائیاں موجود ہیں لیکن میں طوائف کے کوٹھے پر جاتا ہوں۔ اس سے جب کہا گیا کہ ناچنے گانے والیوں کے پاس جانا بہت بری بات ہے تم ایسا کیوں

کرتے ہو تو وہ شخص جواب دیتا ہے کہ جب میں دوست احباب کے ساتھ خوب پی لیتا ہوں تو میرے قدم کوٹھوں اور برائیوں کے اڈوں کی طرف بڑھتے ہیں ۔ کبھی میں ریس کھیلنے چلا جاتا ہوں تو کبھی قمار بازی کے اڈوں پر پہنچ جاتا ہوں ۔ ایسی صورت حال کے لئے سوال یہ کیا جاسکتا ہے کہ نشہ کے بغیر بھی لوگ ریس کے لئے یا جوے کے لئے چلے جاتے ہیں ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی صورتوں میں ریس جوا اور دوسری بری عادتیں اور غلط سرگرمیاں بھی نشہ بن جاتی ہیں ۔ دولت کا نشہ بھی برا ہوتا ہے اور اقتدار کا نشہ بھی کچھ کم نقصان رساں نہیں ہوتا ۔ طاقت کا نشہ بھی انسان کو اپنی طاقت کے غلط استعمال کے لئے مجبور کردیتا ہے ۔ کتنے ہی لوگ طاقت ور ہونے کی وجہ سے زور زبردستی سے ڈرا دھمکا کر یا غنڈہ گردی کے ذریعہ دوسروں کو پریشان کرتے ہیں ۔

کتنے ہی جرائم جن میں غنڈہ گردی لوٹ مار قتل وغیرہ شامل ہیں نشہ کے استعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں کسی کو شراب پلاکر یا کوئی دوسرا نشہ پلا کر اس سے اس قسم کے کام لئے جاتے ہیں کیونکہ ہوش و حواس کی حالت میں وہ ایسے کام نہیں کرسکتا اور یہ کیسی عجیب و غریب غلط فہمی ہے کہ آپ شراب پی کر اپنا ذہن الجھنوں سے کچھ دیر کے لئے پاک کرسکتے ہیں ۔ ایسی غلط فہمی کا شکار لوگ جو عام طور پر اچھے دوست اچھے شوہر اور اچھے باپ

بھی ہوتے ہیں کثرت شراب نوشی سے اپنے آپ کو موت کے حوالے کردیتے ہیں۔

مغربی ملکوں میں اور دنیا کے دوسرے خوشحال اور ترقی یافتہ ملکوں میں دنیا بھر کی اخلاقی برائیوں اور سماجی لعنتوں کا بنیادی سبب نشہ ہی ہے ڈرگ یا منشیات کا استعمال آج دنیا کا سب سے بڑا اخلاقی اور سماجی مسئلہ بنا ہوا ہے جس کی وجہ سے کروڑوں لوگوں کی زندگی برباد ہورہی ہے اور قتل وخوں اسمگلنگ اور دوسرے جرائم کو بھی فروغ حاصل ہورہا ہے۔

نشہ کی ان برائیوں کو محسوس کرتے ہوئے بابائے قوم گاندھی جی نے نشہ بندی کو ہمارے ملک کے لئے ضروری قرار دیا تھا۔ چنانچہ ملک کی مختلف ریاستوں میں بتدریج نشہ بندی نافذ کی جارہی ہے۔ آندھرا پردیش میں بھی دیسی شراب کے استعمال پر پابندی عائد کردی گئی ہے اور منشیات کے استعمال کے سلسلے میں دوسری تحدیدات بھی عائد کی گئی ہیں اور عاید کی جارہی ہیں۔ جس کی وجہ سے حکومت کو فی الوقت سالانہ چھ سو کروڑ روپیے کی آمدنی کا نقصان ہورہا ہے لیکن چھ سو کروڑ ہی ہنیں ہزاروں کروڑ روپے کے نقصانات کے مقابلے میں وہ فوائد زیادہ اہمیت رکھتے ہیں جو نشہ بندی کی وجہ سے فرد اور سماج کو اور ملک اور قوم کو

حاصل ہوں گے۔

زندگی کو تباہی کے دہانے سے واپس لانے کے لئے سرکاری مشنری بہت کچھ کر رہی ہے لیکن یہ ساری کاروائیاں یہ دھاوے یہ سزائیں اس وقت تک بیکار ہیں جوتک کہ سماج کے اندر سے ایک طاقتور ہاتھ نہ ابھرے اور اس برائی کا گلا نہ گھونٹ ڈالے۔

(ریڈیائی تقریر)

ثبوت

زندگی زندہ دلی کا نام ہے مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

زندگی اور زندہ دلی یہ وہ مرکب ہے جو ہر کس وناکس کو نصیب نہیں ہوتا بعض ایسے اشخاص ہیں جن کو زندگی نصیب ہوتی ہے تو بعضوں کو زندہ دلی ۔ زندگی نصیب ہونے کے باوجود زندہ دلی کا پایا جانا بعض صورتوں میں ایسا ہی ہے جیسے بغیر بیج کا جام اور بغیر گٹھلی کا آم ۔ ماہر نباتیات سے جام اور آم کے درخت لگانے کی ترکیب دریافت کی جائے تو ہماری ناقص رائے میں وہ صاف اور شفاف نہیں بلکہ واضح انداز کی ایک ترکیب یہ بتائے گا کہ جام کے بیج اور آم کی گٹھلیوں کو بویا جائے تو درخت اگ آئے گا لیکن ان درختوں سے حاصل شدہ میوؤں میں بیج اور گٹھلیوں کے غائب ہو جانے کی وجہ دریافت کی جائے تو شاید وہ کہے گا کہ یہ وہ قسم ہے جس میں بیج اور گٹھلی نہیں پائی جاتی ! اسی طرح اکثر زندگیاں ایسی ہوتی ہیں جن میں زندہ دلی سرے سے نہیں پائی جاتی ۔

ثبوت بھی ایک ایسی ہی شئے ہے جو بعض صورتوں میں پایا جاتا ہے اور بعض صورتوں میں ایسے غائب ہو جاتا ہے جیسے گدھے کے سر سے

سیننگ۔ انسان کی فطرت میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ ثبوت کی زندگی کو زندہ دفن کر دینا چاہتا ہے۔ آپ ہم روز مرہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ کسی معصوم بچے سے کوئی شئے ٹوٹ جائے تو وہ مارے خوف کے فوری اپنے اطراف کا جائزہ لے گا اور اگر کوئی اس کو دیکھ نہیں رہا ہو تو شہادت کے پائے نہ جانے پر مطمئن ہو کر ثبوت نام کی چیز کو ختم کرنے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔

بچے تو بچے ہوتے ہیں ہم بعض ایسے احباب سے بھی واقف ہیں جو سماج میں اعلیٰ کردار کے مالک بن کر نمایاں زندگی گزارتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے خاندان اور والدین کا نام روشن کرنے کی مقدور بھر کوششوں میں لگے رہتے ہیں اور ایک تاریخ بنانے پر اٹل نظر آتے ہیں اور ایسے ہی لوگ اپنی صحیح تاریخ پیدائش کا حقیقی ثبوت اپنے ہی ہاتھوں زندہ دفن کر دیتے ہیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ماں جس دن اولاد کو جنم دیتی ہے اور فانی دنیا میں خود بھی نیا جنم پاتے ہوئے یہ آرزو کرتی ہے کہ اس کی اولاد بڑی ہو کر اس دن کو کبھی نہ بھولے لیکن زندگی پانے والے بعض اشخاص ظاہری اور سطحی سہولتوں کی خاطر اس اہم اور مقدس دن اور تاریخ کے ثبوت کو بھی اپنی ہی زندگی میں اپنے ہی ہاتھوں دفن کر دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے تھوڑی سی مصلحت سے بہت بڑا تیر مارا ہے پھر یہ تصور کرتے ہیں کہ ہم نے حقیقی ثبوت کو دفن کر کے بہت بڑا کارنامہ

انجام دیا ہے۔

زیر نظر تحریر میں ثبوت، آنکھوں دیکھا ثبوت اور دستاویزی ثبوت وغیرہ کو دانستہ یا غیر دانستہ مٹا دینے کی جو مثالیں پیش کی جارہی ہیں اس پر میں شاید اتنا مجبور نہ ہوتا اگر میرے ایک بزرگ جو اپنے مجموعے کے پیش لفظ میں میرے نام کا ذکر کر دیتے ۔ وہ خود لفظ شاید کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"قبر پہ دیا جلانے کے لئے جس طرح ایک بیٹے کی بہر حال ضرورت ہوتی ہے ۔ اسی طرح شاید ادیب کے لئے کم از کم ایک مجموعے کی اشاعت بے حد ضروری ہے" اور ایک جگہ دکھ بھرے لہجے کی تحریر ملاحظہ ہو "جہاں تک مجھے یاد ہے میری پہلی کہانی ۱۹۵۰ء کے دوران ایوان میں شائع ہوئی تھی جو حیدرآباد سے نکلتا تھا لیکن بد قسمتی سے سینیاریٹی کا یہ دستاویزی ثبوت بھی اب میرے پاس نہیں ہے" ساہتیہ اکیڈیمی نے حیدرآباد کے افسانہ نگاروں کی انتھالوجی شائع کی تو میرے اپنے اس محترم کی کہانی شامل نہیں کی گئی اس پر انھوں نے کیا خوب کہا ہے "اس پر مجھے حیرت ہوئی تھی نہ دکھ" "جس طرح مستند ہے میر کا فرمایا ہوا" اسی طرح بجا ہے ان کا کہنا ۔ لیکن میں اور میری حیثیت کہاں کہ میں اس طرح سوچ سکوں بہر حال اس مجموعے کی اشاعت پر مجھے دلی خوشی ہوئی ساتھ ہی ساتھ پیش لفظ کی آخری سطروں میں شاید میرے نام کو حقیر یا بے معنی سمجھ کر ذکر نہیں کیا تو مجھے اپنے ایک دوست، جو آج کل جدہ میں فارن کرنسی

کا جائز فائدہ اٹھا رہے ہیں، کے الفاظ بے ساختہ یاد آ گئے ، جب اُس کتاب کی اشاعت کے لئے ابتدائی بات چیت ہو رہی تھی ، اس وقت میری موجودگی اور اشاعت کے سلسلے میں کچھ ذمہ داری سونپی جارہی تھی اس پر انھوں نے کہا تھا " اوہو اب آپ کا بھی نام کتاب میں شامل ہوگا! " نہ جانے اس او ہو! " میں کیا بات پوشیدہ تھی کہ اس جملے پر ـــــ کیوں مجھے بے حد مسرت ہوئی تھی - تب اپنا نام پیش لفظ کے ثبوت میں نہ پاکر نہ جانے کیوں دکھ ہوا اس مجموعے میں میرے استاد محترم کا رول ہنایت اہم رہا ہے لیکن یہ تمام نشستیں مصنف کے گھر پر ہوا کرتی تھیں اور میں استاد محترم کو اپنے سر پر بٹھا (اٹھا) کر لے جایا کرتا اور مجھے یاد ہے کہ میں نے کاتب کے گھر کے بھی چکر لگائے لیکن بد قسمتی سے ان تمام باتوں کا ثبوت میرے پاس موجود ہنیں ہے ؎

اس بے وفا جہاں میں وفا ڈھونڈتے رہے
ناداں تھے کتنے ہم کہ یہ کیا ڈھونڈتے رہے

واہ حیدرآباد

ڈاکٹر عابد معز کی کتاب " واہ حیدرآباد " اس تحریر کے ساتھ " عزیز دوست جناب میر فاروق علی صاحب کے لئے خلوص کے ساتھ ---- عابد معز ۸ فبروری ۹۴ء " مصطفی کمال صاحب نے ۹ / اپریل ۹۴ء کو میرے حوالے کی ۔

کتاب میں چند باتیں اہم ہوتی ہیں جس سے کوئی صاحب دانش ہی نہیں بلکہ کم فہم بھی انکار نہیں کرسکتا پہلی بات کتاب کا نام --- دوسری بات ٹائٹل ، تیسری بات مصنف اور چوتھی بات مصنف کی تحریر ۔کتاب کا نام ایسا ہے کہ تاقیامت حیدرآباد کے باشندے ، چاہے حیدرآباد میں ہوں یا دنیا کے کسی حصے میں زندگی بسر کررہے ہوں، حیدرآباد کے نام کو دیکھ کر کتاب پر ٹوٹ پڑیں گے ۔ اس پر، سونے پہ سہاگا کے مصداق واہ کا لفظ حیدرآباد پر نگینہ جڑدینے کے مماثل ہے لیکن یہ وہ نگینہ نہیں جس کے اوپر چونا اور اندر مٹی ہوتی ہے ۔

خوبصورت ٹائیٹل ایسا کہ ٹائیٹل پر نظر ہٹتی نہیں ہے بلکہ نظر لگ جانے کا اندیشہ پیدا ہورہا ہے۔ پیارے پیارے ٹائیٹل کو کہیں میری نظر نہ لگے۔ یا یوں کہنا درست ہوگا کہ ٹائیٹل کو دیکھنے کے بعد سے

"وہ آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھتے پری کی طرف"

BACE PAGE پر نہایت ہی خوبصورت تصویر ہے، ایسا معلوم ہورہا ہے کہ دو چار دہے قبل حیدرآباد میں کم عمر لڑکیاں ایسی تنگ چوٹی ڈالتیں کہ پیشانی کے اوپر سے بال اتنے چپک جاتے کہ بال کم ہونے کا گماں ہوتا تھا اسی طرح مصنف نے بالوں میں ایسی کنگھی کر رکھی ہے کہ اس کی وجہ سے پیشانی کے حدود میں کافی اضافہ ہوگیا ہے اور کافی دور تک بال نظر نہیں آرہے ہیں پھر بھی تصویر خوب ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کا خاندانی نام پوسٹ گریجویشن کے ساتھ عثمانیہ میڈیکل کالج کا نام ہندوپاک کے مختلف اخبارات اور رسائل میں مضامین شائع ہونے اور ہندو بیرون ہند مضامین سنانے کا ذکر ہے۔ سعودی عرب کے اردو حلقوں کی جانی پہچانی اور مقبول شخصیت کا ذکر خوب ہے۔ تیسری اہم بات مصنف کی ہے جن کا حیدرآبادی ہونا ہی کافی ہے۔ آپ نے اپنے ماں باپ اور خاندان کا نام ہی نہیں روشن کیا بلکہ حیدرآباد کی روشنی میں ایک دیپ" واہ حیدرآباد" کا جلا کر روشنی میں اضافہ کیا۔

آپ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں۔ آپ کا کام مریض کے کپڑے اتار کر معائنہ کرنا اور چھوٹے سے کاغذ پر نسخہ تجویز کرنا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کاغذ پر نسخے سے نمایاں آپ کا نام جلی حرفوں میں لکھا ہوتا ہے۔

اس کتاب پر مصطفیٰ کمال صاحب ایڈیٹر "شگوفہ" کا مقدمہ پڑھنے کو ملا۔ ان کی طویل تحریر پڑھ کر خوشی ہوئی۔ عابد معز صاحب میری نظر میں مبارکباد کے مستحق ہو گئے ہیں۔ ویسے بھی وہی پھول سر چڑھتا ہے جو چمن سے نکلتا ہے۔ عابد معز صاحب اگر حیدرآباد میں ہوتے تو شاید مقدمہ ایسا نہیں ہوتا، تب مقدمہ مختصر ہوتا اور ان اہم نکات کا ذکر شاید نہ ہوتا۔

1 ۔ حیدرآباد کی تہذیبی، سماجی اور سیاسی زندگی پر اتنے ڈھیر سارے مضامین عابد معز کے علاوہ کسی مزاح نگار نے نہیں لکھے۔

2 ۔ جس مقام پر پہنچ کر سنجیدہ نگار چپ سادھ لیتا ہے اس سلسلے کو مزاح نگار عابد معز نے بڑے شگفتہ انداز میں دراز کیا اور شہری زندگی کے پیچ و خم کی بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ عکس کشی کی ہے۔

3 ۔ حیدرآباد ان کے لئے بت ہزار شیوہ ہے جس کی ہر ادا انہیں بے حد عزیز ہے۔ مصطفیٰ کمال صاحب نے آخر میں اس یقین کے ساتھ مقدمہ ختم کیا ہے:۔

" مجھے یقین ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کو سراہا جائے گا۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے " واہ حیدرآباد " پر مکمل اور بھرپور روشنی ڈالی ہے جس کو پڑھنے سے قاری، مصنف کے کارنامے سے بڑی حد تک واقف ہوجاتا ہے اور مضامین پڑھنے کی طرف شدت سے راغب ہوتا ہے یہی بات مصنف کی ہمت افزائی اور ادب میں مقام پیدا کرنے کے لیے مہمیز کا کام کرجاتی ہے۔ میں ایک قاری کی حیثیت سے ڈاکٹر ستیہ پال آنند کا مشکور ہوں۔ موصوف کی آخری دو سطریں مضامین کو سمجھنے کے لئے بہت کافی نظر آتی ہیں۔

" یہ اور بات ہے کہ اپنی قسم کی اس واحد کتاب میں جو ایک ہی شہر کا اعلامیہ بھی ہے طربیہ بھی اور حزنیہ بھی۔ شاید آپ کو " واہ حیدرآباد " کے پیچھے ہلکی سی آہ حیدرآباد بھی سنائی دے۔ رونے بسورنے سے ہنسنا یقیناً بہتر ہے چاہے اس ہنسی کی آڑ میں دل کا خون ہی کیوں نہ ہورہا ہو " ۔

بقول ڈاکٹر عابد معز صاحب کے یہ تمام مضامین جو " واہ حیدرآباد " میں شامل ہیں، ماہ نامہ " شگوفہ " میں شائع ہوچکے ہیں۔ اس کے باوجود موصوف نے ان مضامین کو کتابی شکل دی ہے اس میں واضح طور پر ان کی ذہانت کو دخل ہے کیونکہ ڈاکٹر عابد معز چاہتے ہیں کہ ان کے مضامین

اعلیٰ درجے کی Laboratory میں Analyse ہوں ۔ ڈاکٹر ہونے کے ناطے " شگوفہ " میں اشاعت کے بعد کی رپورٹ پر مطمئن نہ ہوکر انھوں نے کتابی شکل دی ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ مطالعے کا ذوق رکھنے والے احباب ، رسالوں سے زیادہ کتابوں کو پڑھنا پسند کرتے ہیں ۔ کتابوں کی غیر موجودگی میں رسالوں کے مطالعے پر اکتفا کرتے ہیں اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کرشن چندر کے کسی گاؤں میں علاج کے لئے ڈاکٹر نہ ہونے پر مریض ، دایا ہی سے علاج پر اکتفا کرتے ہیں ، خود ڈاکٹر عابد معز اکثر ایسا کرتے ہوں گے کہ وہ کئی مریضوں کے خون اور X Ray کی رپورٹ سے مطمئن نہ ہوکر دوسرے Lab میں امتحان کروانے کی سفارش کرتے ہوں گے اور اسی عادت کی بنا پر انھوں نے شگوفہ میں شائع ہوئے مضامین کی رپورٹ پر مطمئن نہ ہوکر کتاب کی شکل میں مضامین شائع فرمائے ہیں اور اسے ہندو پاک ہی نہیں بلکہ اردو دنیا کے نقادوں کے سامنے جو ان کی نظر میں Lab کا کام انجام دیتے ہیں ، پیش کیا ہے ۔ ان تمام نقادوں پر ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی رپورٹ جو اس کتاب میں " شہر میں گھومتا ہوا آئینہ " کے عنوان سے موجود ہے اپنا Influence برقرار رکھے گی ۔

ڈاکٹر عابد معز صاحب کا اقرار نامہ " ہم نے اپنی راہ الگ نکالی "

بہت خوب ہے - یہ بات بالکل واضح ہے کہ حیدرآباد شہر میں دانشوروں ادیبوں اور شاعروں نے شہر حیدرآباد کی خوبصورتی اور خوبیوں پر اتنی گہری روشنی ڈالی ہے کہ اگر ڈاکٹر عابد معز صاحب اس چکاچوند روشنی میں اپنا دیا جلاتے تو ناکام رہتے - جناب عابد معز پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں ڈاکٹر ہمیشہ ناکامی کے ڈر سے مریض کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور دوسرے ڈاکٹر کی طرف رجوع ہو جاتے ہیں اسی طرح انھوں نے اپنی راہ الگ نکال کر حقیقی ڈاکٹر ہونے کا ثبوت دیا -

اب ڈاکٹر عابد معز کے چند لازمی سوالات کا جواب ان کے چاہنے والے قاری کو دینا ہے - (معز کوئز)

سوال نمبر 1 - حسب ذیل جملہ کس مضمون کا ہے اور کس پس منظر میں لکھا گیا ہے -

" دوسرے مقام کا کوئی بھی انسان ، انسانیت کے اس شہر میں اپنے آپ کو پردیسی محسوس نہیں کرتا "

سوال نمبر 2 - اس جملے کا رشید احمد صدیقی کے کس مضمون سے ڈاکٹر عابد معز نے استفادہ کیا ہے -

" سنگ مرمر کا پتھر اور لیلۃ القدر کی رات کے بعد عثمان ساگر کا تالاب کی نادر ترکیب دیکھنے میں آئی ہے " -

سوال نمبر 3 - ڈاکٹر عابد معز کے راشن کی درخواست پر یہ تجویز " اس درخواست کو اسٹیٹ آرکائیوز بھیجا جائے تاکہ متن کا ترجمہ حاصل ہوسکے" - حیدرآباد میں محکمۂ ترجمہ کی موجودگی میں افسر مجاز کی تجویز آرکائیوز کو بھیجنا درست ہے یا ڈاکٹر عابد معز کی معلومات نامکمل ہیں ؟ تفصیل سے روشنی ڈالئے -

سوال نمبر 4 - " بوسیدہ عمارت میں تعلیم حاصل کرنے سے زیادہ خطرہ تو اردو کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے میں ہے" -

ڈاکٹر عابد معز کا یہ خیال کہاں تک درست ہے اور اس میں طنز کا فیصد کتنا ہے ؟

سوال نمبر 5 - یہ جملہ ڈاکٹر عابد معز کے مجموعے " واہ حیدرآباد" کا ہے یا " آہ حیدرآباد" کا ہے اور یہ کس پس منظر میں کہا گیا ہے ؟

" غرض ہمارے شہر میں وہ تہذیب ہی نہ رہی جس کی شاخ پر اردو زبان نے کبھی اپنا آشیانہ بنایا تھا" -

سوال نمبر 6 - سکندر اعظم نے مرتے وقت کہا تھا - " میں کئی اطبا کی موجودگی میں دم توڑ رہا ہوں" - انسان کے دم توڑنے اور زبان کے دم توڑنے (اگر توڑ رہی ہو تو) میں کیا مطابقت ہے تفصیل سے بیان کیجئے -

سوال نمبر 7 - حسب ذیل متن کس مضمون کی طرف اشارہ کرتا ہے، بیان کیجئے؟

" چارمینار کی تعمیر اور تاج محل کی تعمیر کے سلسلے میں ہندوستان کی گندہ سیاست کا جو پرچار ہے اس پر ڈاکٹر عابد معز نے چارمینار کی تعمیر کا حوالہ اس خوبی سے دیا ہے کہ بے ساختہ داد نکل جاتی ہے"۔

سوال نمبر 8 - مضمون " افواہوں کا شہر" کی دلچسپ کہانی " آسمان گر رہا ہے" پر تفصیل سے روشنی اس طرح ڈالئے جیسا کہ چارمینار پر / 26 جنوری اور 15 / اگسٹ کو ڈالی جاتی ہے۔

" مرغی کا چوزہ، درخت کے نیچے دانہ چگ رہا تھا کہ اس کے سر پر ایک پتہ آن گرا۔ اس نے صدا لگائی " آسمان گر رہا ہے" اور جنگل کے بادشاہ کو آسمان گرنے کی اطلاع دینے کے لئے دوڑنے لگا۔ راستے میں چند مرغیاں اور بطخیں ملیں۔ سبھی نے اس واقعے کو سنا، آسمان گرنے پر تشویش کا اظہار کیا اور چوزے کی قیادت میں بادشاہ کو اطلاع دینے، جلوس کی شکل میں جانے لگے۔ لومڑی سے ملاقات ہوئی۔ آسمان گرنے کے واقعے پر افسوس کرتے ہوئے جنگل کے بادشاہ سے ملانے کے لیے وہ چوزہ اور اس کے ساتھیوں کو ایک غار میں لے گئی"۔

" ہمارا شہر خوب صورت ہے" میں بھرپور طنز موجود ہے۔ ڈاکٹر

صاحب نے شہر کی خوبصورتی صفائی، تنگ گلیوں اور ارباب حکومت کی لاپرواہی کو نشانہ بنایا ہے اور اس میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ اس مضمون میں شہر میں ہوئے فرقہ وارانہ فسادات کے غم سے حددرجہ نڈھال نظر آتے ہیں۔ اور اس کی ترجمانی بہت عمدگی سے کی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"لکھتے لکھتے سیاہی بلکہ خون خشک ہو چکا ہے

"خاکی نیکر اور سفید بنیان" کے زیر عنوان مضمون حکومت خاص کر شہر حیدرآباد کے محکمہ پولیس کی کارکردگی پر ایک جامع رپورٹ کا درجہ رکھتا ہے جس کو عالمی کانفرنس بھی شہر میں پولیس کی ناقص کارکردگی کے عنوان پر تفصیلی نوٹ سمجھا جاسکتا ہے۔ اس قسم کا نوٹ ایک ذہین پولیس آفیسر یا دردمند ڈاکٹر ہی تیار کرسکتا ہے کیونکہ پولیس اور ڈاکٹر کا حادثاتی جرائم کی تحقیقات میں چولی دامن کی ساتھ ہوتا ہے۔

ضرب المثل یا فلمی ڈائیلاگ میں تبدیلی یا اضافہ بہت مشکل ہوتا ہے لیکن ڈاکٹر عابد معز نے فلمی ڈائیلاگ میں اضافہ کرکے دکھلادیا کہ کوئی کام مشکل ہنیں ہے۔ مثلاً

"سوجا بیٹا، ہنیں تو گبر سنگھ آجائے گا اور پولیس والے کچھ نہ کرسکیں گے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر عابد معز جن دنوں حیدرآباد میں محکمہ صحت و

طبابت سے وابستہ تھے، یہ رپورٹ میڈیکل اور پولیس کانفرنس میں پڑھنے کے لئے تیار کی تھی اور پڑالی گئی اور ماہنامہ "شگوفہ" میں "مال مسروقہ" کے عنوان سے چھاپ دی گئی۔ بہر حال بہت خوب ہے۔

ڈاکٹر عابد معز اپنے مضامین کے مجموعے "واہ حیدرآباد" میں شامل آخری مضمون "فرقہ وارانہ فسادات پر جانوروں کی کانفرنس" تحریر فرما کر حیدرآباد کے مایہ ناز سپوت ہونے کا حق ادا کر چکے ہیں۔ ان کے درد مند دل پر حیدرآباد کے فسادات سے جو چوٹ لگی اس کی عکاسی اس مضمون میں ملتی ہے اور نام نہاد قوم کے خادموں (لیڈروں) اور پولیس کی نااہلی پر بھرپور طمانچہ ہے۔ طمانچہ ایک ہلکی سی سزا اور تنبیہہ ہوتی ہے۔ کاش اس تنبیہہ کے بعد قوم کے لیڈروں اور پولیس کے ارباب مجاز کو ہوش آجائے تو انسان کو جانوروں سے تھوتھپڑ کروانے کی نوبت دوبارہ نہیں آئے گی۔ مثلاً

"ہماری درندگی کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ درندے اپنے ہم جنسوں کا شکار نہیں کرتے لیکن انسان بلا کسی مقصد اور وجہ کے اپنے بھائیوں کا قتل و خون کرتا ہے"۔

"میں اور میری بہنیں بھینس بیگم بلالحاظ مذہب و ملت اپنے جگر کے ٹکڑوں کا حق تلف کر کے انسانوں کو دودھ پلاتی ہیں۔ کبھی سوچتی بھی

ہنہیں کہ ہمارا دودھ پینے والے کا مذہب کیا ہے، وہ کس علاقہ کا رہنے والا ہے، اس کی زبان کون سی ہے اس کا رنگ کیا ہے، ہم جانور، رنگ، نسل اور ذات پات سے نیاز ہوکر بنی نوع انسان کی خدمت کرتے ہیں اور خود انسان، انسانیت کا دشمن بن کر اپنے ہی پیروں پر کلہاڑی ماررہا ہے"۔

بہر حال اس ہلکے پھلکے تبصرے کے ذریعہ ڈاکٹر عابد معز کی اس کامیاب پیش کش پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے مضطر مجاز کے اس مصرع پر ختم کرتا ہوں۔

ع "چھوڑو بھی اب اس قصے کو کیا دینا ہے طول میاں"

زندہ دلان حیدرآباد کا ایک اور کارنامہ

(ایک مزاحیہ سرسری تبصرہ)

۱۹۹۳ء میں اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی جانب سے ایک بڑی تعداد میں مسودات کو اعانت دی گئی جن میں طنزومزاح کے ادیب اور شعراء بھی شامل ہیں ۔ جس طرح اشتہارات کی اشاعت پر ایڈیٹر کی جانب سے پابندی نہیں ہوتی اسی طرح طنز و مزاح کی نثر اور شاعری کی اشاعت پر شاید اردو اکیڈمی کی جانب سے کسی پابندی کے بغیر اعانت دی جاتی ہوگی اسکا بخوبی اندازہ اس مجموعہ پر اردو کے نامور اور مسلمہ احباب مثلاً آرٹسٹ سے لے کر نقاد محقق ، ایڈیٹر وغیرہ کی رائے اور سلوک سے ہوتا ہے ۔ اسی طرح کا مصنف کے ساتھ کیا گیا ایک سلوک پیش خدمت ہے ۔ اس قسم کے سلوک سے عام قاری ، چند صفحات کے مطالعے کے بعد کتاب کو رکھ دیتا ہے ، آگے پڑھنے کی ہمت اور خواہش نہیں رہتی ایسے

تخلیق کاروں کو چاہیئے کہ بغیر کسی کی رائے یا سفارش کے اپنے مجموعے شائع فرمائیں ۔ زندہ دلان حیدرآباد ۲۵ سال سے مسلسل طنز و مزاح کے اشاعتی مراحل میں مسلسل ہمت افزائی کا ریکارڈ قائم کئے ہوئے جن میں شگوفہ ، ایک زندہ اور پائندہ مثال ہے اور ان میں " طرفہ تماشہ " بھی شامل ہے ۔ اسی سلسلے میں " ایک مزاحیہ سرسری تبصرہ " ملاحظہ ہو ۔

مسیح انجم سے حیدرآبادی نہیں بلکہ طنز و مزاح کی دنیا بخوبی واقف ہے ۔ وہ جیسے بھی ہیں ۔ بس ان کو بدلا نہیں جاسکتا ۔ " طرفہ تماشہ " میرے ہاتھ میں آیا ٹائیٹل پر نظر ڈالی ، رنگین ٹائیٹل سے آنکھوں کو ٹھنڈک ملی ۔ اس سے مراد آرٹسٹ کی تعریف کرنا نہیں بلکہ خوبصورت سرورق کی مناسبت سے آرٹسٹ نے دو تین قسم کے رنگ بکھیر کر زندہ دلان حیدرآباد کے مزاح نگار کی تخلیقات سے اپنا رشتہ برقرار رکھا ۔ صفحہ ۲ پر خوش خبری یہ پائی کہ " جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ " ۔ یہ رواج پتہ نہیں کب شروع ہوا کہ کاتب کے نام کے آگے جناب یا آخر میں صاحب نہیں لکھا جاتا ۔ درمیان میں جزوی مالی اعانت آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کی اطلاع ملی ۔ اس کو دیکھنے سے یہ خواہش ضرور پیدا ہوئی کہ مسیح انجم اس وقت تک دنیا میں رہیں جب تک اردو اکیڈمیوں کو یہ توفیق ہو کہ نامور ادیب اور شاعر کی تحریر و کلام کو مکمل اعانت کے ساتھ

شایع کریں۔ آخر میں کتاب ملنے کے پتے درج ہیں۔

صفحہ ۳ پر تو مسیح انجم نے غضب ہی کر ڈالا۔ انھوں نے ایک عالمی شہرت یافتہ ہندوستان کی ایک بڑی شخصیت کے نام اس مجموعے کو معنون کر کے اس کو اپنے ماں باپ بیوی بچوں اور استادوں سے بڑھ کر درجہ دے دیا۔ یہ ان کے اعلی درجے کی ظرافت ہے کیونکہ جناب نریندر لوتھر صاحب اب برسراقتدار نہیں رہے۔ صفحہ ۴ بڑا دلچسپ ہے جس پر ڈاکٹر سید مصطفے کمال کی تحریر جو ۱۵ ڈسمبر کو لکھی گئی ہے۔ ان کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وقت کی تنگی نے ان کو مکمل ایک صفحہ بھی لکھنے نہیں دیا کیونکہ سال ۱۹۹۳ء ختم ہو رہا تھا۔ مناسب تو یہ ہوتا کہ وہ ۱۵ ڈسمبر ۹۳ء سے ۱۵ جنوری ۹۴ء تک لکھتے اور کتاب پر مکمل روشنی ڈالتے تاکہ طنز و مزاح کے قاری کے لئے کتاب کے تمام مضامین کے تعلق سے مختصر سی واقفیت ہو جاتی۔ اور قاری کو اس مجموعے میں ڈوب کر یا غوطہ لگا کر طنز و مزاح کو ڈھونڈ نکالنے میں مدد ملتی۔ ڈاکٹر مصطفے کمال نے مسیح انجم کو طنز و مزاح کا ایک فائیو اسٹار (5 Star) باورچی ثابت کر دیا جو مزاح کی لذیذ ڈش تیار کرتا ہے۔

مصنف شگفتگی اور ظرافت کے مرغ کو جب ذبح کرتے ہیں تو باورچی خانے میں جو خون اچھلتا اور جو مرغ کودتا ہوا نظر آتا ہے تو مصطفے

کمال کی باریک بین نگاہ اسے دیکھ لیتی ہے۔ بہر حال مصطفےٰ کمال نے مصنف کی تحریر کا ہی نہیں بلکہ مصنف کی پوشیدہ صلاحیتوں کا بہ غور مطالعہ کیا ہے۔ اس لئے مصنف مبارکباد کے مستحق ہو گئے ہیں۔ صفحہ ۵ پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بالکل واضح ہے۔ قاری کو بہ آسانی سمجھ میں آجائے گا۔ البتہ اس سلسلے میں میری بھی محترم قاری سے درخواست ہے کہ وہ اپنی رائے مصنف کے پتے پر ضرور روانہ کریں۔

صفحہ ۶ پر ڈاکٹر سلمان اطہر جاوید نے مصنف کو ایک محنتی طنز و مزاح نگار بتایا ہے جبکہ طنز و مزاح نگار کو ذہین ہونا پڑتا ہے۔ ذہانت محنت سے آتی ہے یا دماغ کے کسی رگ کے پائے جانے سے پیدا ہوتی ہے؟ یہ مسئلہ تو میڈیکل بورڈ کے غور کرنے کا ہے۔ سلیمان اطہر جاوید نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مصنف کے حلق میں دو تھیلیاں زہر و شہد کی موجود ہیں۔ مصنف سماج میں پھیلا ہوا زہر پی کر اس کا اسٹاک کرلیتا ہے اور دوسری تھیلی سے شکر و شہد کی تقسیم عمل میں لاتا ہے۔ بہر حال انھوں نے مصنف کی تحریر میں طنز کم اور مزاح زیادہ پایا ہے۔

صفحہ ۷ پر ڈاکٹر حامد اللہ ندوی نے بڑی خوبی سے مصنف کی صلاحیتوں کو سراہا ہے۔

صفحہ ۸ پر مضامین کی ترتیب ہے۔ اسمیں مصنف کی مرضی کو

دخل ہے ۔" طرفہ تماشہ " ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے ۔ جو Title page اور Back page کی تصویر کے درمیان مضبوطی سے بائنڈنگ کئے ہوئے ہیں ۔ ان میں بیشتر مضامین مصنف سامعین کے سامنے کھڑے ہو کر سنا چکے ہیں اور سامعین ان کے آگے سیدھے کھڑے ہو کر با آواز بلند سنانے پر کافی داد دے چکے ہیں ۔ لیکن اس داد اور تعریف سے مطمئن نہ ہو کر مصنف نے زندہ دلان حیدرآباد کے اشاعتی پروگرام کے سہارے اس مجموعے کو کتابی شکل دی ہے تاکہ قاری اپنے اپنے ریڈنگ روم یا بیڈروم (Bed Room) میں وقت نکال کر مطالعہ کرے اور اپنی رائے سے نوازے ۔ دیکھنا یہ ہے کہ مصنف کی آرزو کہاں تک پوری ہوتی ہے ۔

سخن (مجموعہ کلام) سرسری تبصرہ

ایک سردارجی سمندر کے کنارے کھڑے ہوئے تھے اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بچہ ڈوب رہا ہے وہ سمندر میں چھلانگ لگا کر اس بچے کو باہر لاتے ہیں ۔ کنارے پر کھڑے ہوئے لوگ سردارجی کی اس بہادری پر تعریف کے پل باندہ رہے تھے کے ان صاحب نے غصے کے عالم میں یہ دریافت فرمایا "پہلے یہ بتلاؤ کہ کس نے مجھے سمندر میں ڈھکیلا تھا ؟ " یہ سنتے ہی سارا منظران کی نادانی اور کم عقلی سے بدل گیا لیکن اس کے برعکس ادبی سمندر میں سپتہ ہنیں چار دہے قبل جناب وقار خلیل کو کس نے ڈھکیلا تھا ۔ یہ بھی سردارجی کی طرح سمندر سے بچے کے بجائے موتی لے کر اوپر آتے ہیں ۔ لیکن ادبی تری سے ادبی خشکی پر آنے کے بعد ادبی ! جارہ داروں سے یہ ہنیں دریافت کرتے کہ کس نے مجھے ڈھکیلا تھا ۔۔

جناب وقار خلیل کو اب شوق سے زیادہ عادت سی ہوگئی ہے کہ وہ ادبی سمندر میں غوطے لگا کر ادبی سپیاں اور موتی نکال لاتے ہیں ۔

جناب وقار خلیل نے دیکھا کہ سردارجی نے ڈوبتے ہوئے بچے کو پانی سے نکال کر ایک کارنامہ انجام دیا ہے ۔ تو انہوں نے سونچا کہ

بچوں کو تعلیم کی روشنی سے سرفراز کرنا چاہئیے ، وہ غوطہ خوری کے ذریعہ سمندر کی تہہ سے بچوں کا ادب نکال کر لائے اور اس کی کامیاب پیش کشی پر آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی نے بچوں کے ادیب اور شاعر کی حیثیت سے نمایاں خدمات کا اعتراف کیا ۔ چنانچہ ان کی مجموعی خدمات پر ان کو خصوصی ایوارڈ پیش کیا گیا ۔

نومبر ۱۹۹۳ میں جناب وقار خلیل نے اپنا شعری مجموعہ " سخن " پیش کیا ٹائٹل (Tittle Page) ہنایت ہی سادا سیدھا اور عمدہ ہے اور ٹائٹل آرٹسٹ کی گہری سوچ اور الجھنوں سے پاک ہے یہ صرف اور صرف غوث آرٹسٹ کے ہی بس کی بات تھی ۔

جناب وقار خلیل نے صرف ایک کو چھوڑ کر تمام اہم اور کار کرد شخصیتوں کے نام اپنے مجموعے کو معنون کیا ہے ۔

مجموعے میں شامل ابتدائی کلام کے مطالعے سے واضح ہوجاتا ہے کہ مصنف نے خداوندِ کریم کی ذات پر ایمان رکھنے والوں کو اپنے احسانات میں شامل کرلیا ہے جس میں وہ کامیاب ہیں چند اشعار پیش ہیں ۔

نوازدے کہ تو بڑا کریم ہے رحیم ہے

(لبیک)

میں قدموں میں لپٹ جاؤں کف پا بن کے جی اٹھوں
دکن میں بے زمینی جی رہا ہے آپ کا شاعر

(یا رسول اللہ)

کتاب حق کے اوراق معطر ہر صدی کے درمیاں اک رابطہ محکم
یہی ایماں یہی سرمایہ احساس ودانش ہے

(روشنی ہی روشنی)

زندگی مذہب کے دائرے میں رہ کر بہ حسن وخوبی گذاری جاسکتی ہے ، بشرطیکہ زندگی کو برتنے کا سلیقہ ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جناب وقار خلیل میں اس کا حوصلہ اور سلیقہ موجود ہے اس کی کامیاب عکاسی ان اشعار میں ملاحظہ فرمائیے۔

کوثر میں نہائی ہوئی شفاف جوانی
مہتاب کی دختر تھی کہ خورشید نشاں تھی

(ملاقات)

غالب کی غزل میر کا انداز بیاں تھی
انشاء کی نزاکت تھی تو مومن کی زباں تھی

(جان من)

جناب وقار خلیل صاحب کی طرح ہر قلم کار کی عین آرزو ہوتی

ہے کہ وہ زندہ جاوید شخصیتوں پر قلم اٹھائیں چنانچہ جناب وقار خلیل نے علامہ اقبال پر جو نظم لکھی ہے وہ اقبالیاتی ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے

جناب وقار خلیل کے اس تیسرے مجموعۂ کلام " سخن " پر پروفیسر مغنی تبسم کا جامع تبصرہ موجود ہے ۔ موصوف زبان وادب کی خدمت میں اپنے آپ کو وقف کرچکے ہیں جنھیں محسن اردو کی صف میں شامل ہونے کا بجا طور پر حق حاصل ہوچکا ہے ۔ آخر میں میں وقار خلیل کے اس آرزو بھرے شعر پر بات اس امید کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ اردو دنیا ان کی قدر اور ہمت افزائی کرے گی ۔

یہ اردو ، کے شاعر کی ہے آرزو ، زمیں اپنا جادو جگاتی رہے
کام ، گھر ، کھیت ، مکتب کی جے کار ہو زندگی جاگتی گنگناتی رہے

(نظم آرزو)

مکتبۂ شعر و حکمت کی مطبوعات

مخدوم محی الدین (از پروفیسر الکسی سوخاچیف)	ترجمہ اسامہ فاروقی	-/100
لفظوں کے آگے (تنقیدی مضامین)	پروفیسر مغنی تبسم	-/60
ایک سخن اور (شاعری)	مضطر مجاز	-/80
بے کار کی باتیں	میر فاروق علی	صرف -/100
دھواں دھواں چراغ جاں (شاعری)	علی الدین نوید	-/60
خودرو (شاعری)	سید بشارت علی بشارت	-/80
رقص تنہائی (شاعری)	علی اصغر	-/50
کماں کا صحرا (شاعری)	مصحف اقبال توصیفی	-/60
ارض بے پیغمبر (شاعری)	مظہر مہدی	-/60
ادھورا سفر (افسانے)	قدیر زماں	-/60
آٹھواں سفر (افسانے)	غلام جیلانی	-/50
حنظل (افسانے)	بیگ احساس	-/80
دھوپ، دیواریں، سمندر، آئینہ (شاعری)	غیاث متین	-/20

------------ مکتبہ شعر و حکمت ------------

6-3-659/2 سوماجی گوڑہ - حیدرآباد 004 500